15



بیسویں صدی کی اسلامی تحریکیں

آیت اللہ شہید استاد مرتضیٰ مطہریؒ

شہید مطہری فاونڈیشن (پاکستان)

www.shaheedmutahhari.com


بسم الله الرحمن الرحيم

بیسویں صدی کی

اسلامی تحریکیں

بیسویں صدی کی

اسلامی تحریکیں

استاد شہید مرتضیٰ مطہری m

مترجم
ڈاکٹر ناصر حسین نقوی

شہید مطہری فاونڈیشن لاہور پاکستان

نام کتاب: بیسویں صدی کی اسلامی تحریکیں
تصنیف: استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ
مترجم: ڈاکٹر ناصر حسین نقوی
کمپوزنگ: انس کمیونیکیشن 03334052818
سال اشاعت 2014
ناشر: شہید مرتضیٰ مطہری فاونڈیشن

ملنے کا پتہ
معراج کمپنی
بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد
0333-5234311

فہرست مضامین

عرض ناشر

عظیم ہے وہ خدا جس نے کائنات کو پیدا کیا اور انسان کو اپنا خلیفہ بنایا، اس کو عقل دی اور تسخیر کے لئے دنیا اس کے آگے رکھ دی۔ درود ہے اس عظیم ہستی پر جس کی خاطر یہ دو جہان کا میلہ سجایا گیا ہے اور سلام ہے اس ہادیٔ عالم کی اولاد پر جو جنت کی وارث، اور انسان کے لئے راہنما ہے۔

قارئین کرام انتہائی مسرت کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ شہید مرتضیٰ مطہری فاونڈیشن ایک نیا اشاعتی ادارہ قائم کیا گیا ہے جس کا مقصد استاد شہید مرتضیٰ مطہری کے افکار اور ان کے مشن کو لوگوں تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ ہی ان کی کتب کو شائع کرنا ہے۔ اس سلسلے میں ایک پوری ٹیم کام رہی ہے بہت سی کتب پر کام اور کچھ کی تلاش جاری ہے۔ اس سے قبل مذکورہ کتاب اسلام آباد سے '' دانشکدہ '' نے شائع کی ہم دانشکدہ سمیت ان تمام لوگوں کے جنھوں نے کسی طرح بھی ادارہ کے ساتھ تعاون کیا یا اس کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اللہ پاک ان سب کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

ملتمسِ دعا

انتظامیہ وارا کین

شہید مرتضیٰ مطہری فاونڈیشن

مُقَدِّمَہ

صدر اسلام کے بعد ہر دور میں مسلمان معاشروں کے اندر ایسی تحریکیں جنم لیتی رہیں جن کا مقصد معاشرے میں موجود بگاڑ اور خرابیوں کی اصلاح تھا۔ ان اصلاحی تحریکوں کے اثرات تا دیر ان معاشروں پر باقی رہے لیکن جس طرح انسان کو راہِ ہدایت پر قائم رہنے اور اللہ سے اپنا رابطہ جوڑے رکھنے کے لئے ہمیشہ ایک ناصح، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح انسانی معاشروں کو بھی اللہ کے راستے پر گامزن رکھنے کے لئے مصلحین کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کسی معاشرے میں پنپنے والی برائیوں کے نتیجے میں معاشرے کے نظام کو طاغوتی دیمک چاٹنے لگتی ہے تو ایسے میں ایک اصلاحی اور تعمیری تحریک کی ضرورت اجاگر ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ عام طور پر کسی معاشرے میں اصلاح کے نعروں کے ساتھ اٹھنے والی تحریک کا مکمل طور پر اصلاحی اور اسلامی ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ ایک اصلاحی تحریک کے خدوخال اور شرائط کیا ہیں، اس کے اہداف، راستے، رہنما اصول کون سے ہیں اور ایسی اصلاحی تحریک کو چلانے کے لئے کس طرح کی شرائط چاہئیں .... یہ سب قابل بحث عناوین ہیں۔

زیرِ نظر کتاب مفکرِ اسلام استاد شہید مرتضیٰ مطہری کی اسی موضوع پر ایک قیمتی تحریر ہے جس میں انہوں نے ضروری عناوین پر بقدر ضرورت گفتگو فرمائی ہے۔ استاد مطہریm اپنے علمی، فکری اور فلسفی مقام کی عظمت کے ساتھ ساتھ ہمسایہ ملک ایران میں رونما ہونے والے سب سے بڑے اسلامی انقلاب کے پیش رو اور راہنما بھی ہیں اور بقول بانی انقلاب حضرت امام آیت اللہ العظمیٰ خمینیm اور رہبر انقلاب اسلامی حضرت آیت اللہ العظمیٰ امام خامنہ ای کے، وہ کجروی اور انحرافات کے مقابلے میں کوہ استقامت بھی تھے اور اس عظیم انقلاب کا فکری ستون بھی۔

لہٰذا ایک ایسی عظیم اصلاحی تحریک اور انقلاب کے نشیب و فراز سے گزرنے کے بعد گزشتہ صدی کی اسلامی تحریکوں کے بارے میں ان کی رائے کسی بھی دوسرے صاحبِ فکر و دانش کے مقابلے میں زیادہ حقیقت پسندانہ اور قابلِ عمل ہے۔

پاکستان میں بھی قیام پاکستان کے وقت سے ہی اصلاح کے نام پر اسلامی تحریکیں چلتی رہیں اور آج بھی متعدد اسلامی جماعتیں اپنے آپ کو اس سرزمین میں تحریک اسلامی کی امین اور وارث قرار دیتی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمان اپنی اسلام پسندی کی وجہ سے دنیا بھر میں شہرت رکھتے ہیں اسی لئے ہر ایسی تحریک کو یہاں پر پذیرائی ملتی ہے لیکن ایک حقیقی اسلامی اور اصلاحی تحریک کے چلانے کے لئے اس کے رہنماؤں اور کارکنوں کا اس کی ضروریات سے کماحقہ واقفیت اور آگاہ ہونا نہایت ضروری ہے۔

لہٰذا استاد شہید نے ایسی شخصیات اور تحریکوں کے رہنماؤں کو بھی اس کتاب میں مخاطب فرمایا ہے۔

استاد شہید مرتضیٰ مطہری فرماتے ہیں:

”میں یہ اپنا فرض اولین سمجھتا ہوں کہ اسلامی تحریک کے ان بڑے

بڑے رہنماؤں کو کہ جن کی میرے ذہن میں بہت قدر و منزلت ہے، آگاہ کر دوں کہ وہ بیرونی نظریات پر اسلامی فکر کی مہر ثبت کر کے ارادی یا غیر ارادی طور پر اس کا پرچار کر رہے ہیں اور یہ بات اسلام کی بنیادوں کے لئے بہت ہی خطرناک ہے۔ ہم ذمہ دار اشخاص ہیں اور ہم نے دورِ جدید کی زبان میں اسلام کے کئی پہلوؤں پر زیادہ لٹریچر شائع نہیں کیا ہے۔ یہ یقینی بات ہے کہ اگر ہم نے پاک اور صاف پانی زیادہ مقدار میں جمع کیا ہوتا تو لوگ گندے پانی سے اپنے آپ کو سیراب نہ کرتے۔ اس کا حل یہ ہے کہ ہم اسلامی مکتبِ فکر کے نظریات کو آج کی زبان میں متعارف کرائیں۔ ہمارے دینی رہنماؤں کو ان عظیم تعلیمی اور فکری ذمہ داریوں سے آگاہ ہونا چاہیے جو ان کے کندھوں پر ڈالی گئی ہیں۔ وہ صرف فقہ اور بنیادی امور تک اپنے آپ کو محدود نہ رکھیں کیونکہ ایسا کرنے سے وہ دور جدید کے نوجوانوں کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکیں گے''۔

پاکستان کی سرزمین میں خالص اسلامِ محمدی کے فروغ اور معاشرے کی فکری و علمی اصلاح کے لئے سر اٹھاتی تحریکوں بالخصوص ''مجلس وحدت مسلمین پاکستان'' کے اکابرین اور کارکنوں کی فکری رہنمائی کے لئے استاد مطہری m کی یہ تحریر ''بیسویں صدی کی اسلامی تحریکیں'' قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے، اس تحریر میں ماضی قریب کی اسلامی تحریکوں کے خدوخال، نظریات اور ان کے اہداف کو مفید حد تک بیان کیا گیا ہے۔ ایک

اور اہم ترین موضوع جس کی طرف اکثر تنظیمی اور تحریکی کارکنوں کی توجہ نہیں ہوتی یا بہت کم ہوتی ہے کسی بھی ایسی اصلاحی تحریک کو درپیش اندرونی خطرات اور آفات ہیں، کتاب حاضر میں استاد شہید مطہریm نے اس بارے میں بھی تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ قارئین اس کتاب کو پڑھنے کے بعد کسی اصلاحی اور تعمیری تحریک کے بارے میں اسلامی نکتہ نظر سے نہ صرف آگاہ ہوں گے بلکہ عملی میدان میں اس کتاب سے انشاء اللہ استفادہ بھی فرمائیں گے۔

اصلاح

اصلاح کا مطلب ”نظم و باقاعدگی پیدا کرنا“ ہے جس کا الٹ فساد ہے۔ اصلاح اور فساد ایک متضاد جوڑا بناتا ہے جس کا ذکر قرآن اور دیگر الہامی کتابوں میں اکثر آیا ہے۔ متضاد جوڑے جو کہ اعتقادی اور اجتماعی اصطلاحوں میں استعمال ہوتے ہیں کو اگر آمنے سامنے رکھا جائے تو مطالب کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مثلاً ہم یہ متضاد جوڑے سنتے ہیں: ”توحید و شرک، ایمان و کفر، ہدایت و ضلالت، عدل و ظلم، خیر و شر، اطاعت و معصیت، شکر و کفران، اتحاد و اختلاف، غیبت و شہادت، علمیت و جہلیت، تقویٰ و فسق، تکبر و انکسار وغیرہ“۔

کچھ متضاد اصطلاحیں ایک دوسرے کے معنی کی وضاحت کر کے مثبت اور منفی پہلو کا اظہار کرتی ہیں۔ اصلاح اور فساد اسی قسم کی اصطلاحیں ہیں۔ قرآن میں اصلاح کا استعمال بعض دفعہ دو افراد کے رابطے (اصلاح ذات البین) کے لئے، بعض دفعہ خاندانی ماحول کے متعلق اور بعض دفعہ وسیع تر معاشرتی ماحول کے متعلق ہوا ہے جو کہ اس وقت میرے پیش نظر ہے اور اس کا قرآن کی کئی سورتوں میں ذکر ہوا ہے [1] اس کے بعد جب میں اس مضمون میں لفظ اصلاح استعمال کروں گا تو میرا مقصد معاشرے کی سطح پر اصلاح ہوگا یعنی اصلاح معاشرہ ہوگا۔

قرآن نے پیغمبروں کو مصلح قرار دیا ہے جیسے کہ حضرت شعیبؑ نے فرمایا:

إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴿٨٨﴾

(سورہ ہود ۸۸)

---

[1] سورہ بقرہ ۱۱، ۲۲۰ سورہ اعراف ۵۶، ۸۵، ۱۷۰ اس ورہ ہود ۱۱، ۸۸ سورہ قصص ۱۹

''میں اپنی استطاعت کے آخری امکان تک صرف اصلاح کرنا چاہتا ہوں، میری کامیابی صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، میں صرف اسی پر بھروسہ کرتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں''۔

اس کے برعکس قرآن منافقانہ مصلحتوں کی سختی سے سرزنش کرتا ہے۔قرآن میں وارد ہوا ہے کہ:

وَاِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ﴿۱۱﴾

(سورۃ بقرہ ۱۱)

''اگر ان کو بتایا جائے کہ زمین پر فساد نہ پھیلاؤ، تو وہ کہتے ہیں کہ وہ تو صرف اصلاح کر رہے ہیں، ایسا ہرگز نہیں! وہ تو زمین پر فساد پھیلا رہے ہیں لیکن وہ خود اس کو محسوس نہیں کرتے''۔

بے شک اصلاح، اسلام کی روح ہے۔ ہر مسلمان بحیثیت مسلمان، اصلاح کا طالب ہے اور لاشعوری طور پر اصلاح کا طرفدار ہے۔قرآن میں اصلاح کی چاہت پیغمبری کا جزو قرار دی گئی ہے اور اس کی اہمیت ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' جیسی ہے جو کہ اسلام کی اجتماعی تعلیمات کا ایک رکن ہے۔ ہر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اجتماعی اصلاح کے زمرہ میں نہیں آتا لیکن اجتماعی اصلاح ان تمام امور پر محیط ہے جو کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے زمرہ میں آتے ہیں۔لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ہر وہ مسلمان جو کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے بارے میں محتاط ہوتا ہے وہ اجتماعی اصلاح کے بارے میں بھی کافی حساس ہوتا ہے۔

یہ امر قابل صد ستائش اور باعث مسرت ہے کہ دورِ جدید میں اجتماعی اصلاح کے بارے لوگوں میں احساس پیدا ہو رہا ہے لیکن اس رجحان میں کچھ افراط اور بے

اعتدالی پیدا ہو گئی ہے اس طرح کہ وہ تمام خدمات جو اجتماعی اصلاح کے علاوہ پیش کی گئی تھیں آج ان کی اہمیت کو گھٹا دیا گیا ہے اور ہر خدمت کو اجتماعی اصلاح کے زمرہ میں پرکھا جاتا ہے اور انسان کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ ان امور سے لگایا جاتا ہے جو کہ وہ اجتماعی اصلاح کے لئے سرانجام دیتا ہے۔ یہ اندازِ فکر صحیح نہیں ہے۔ اجتماعی اصلاح یقینا معاشرے کی ایک خدمت ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر خدمت اجتماعی اصلاح ہو۔ تپ دق اور سرطان کے علاج کی ایجاد خدمت تو ہے لیکن اصلاح نہیں ہے۔ وہ ڈاکٹر جو صبح سے لے کر شام تک بیماریوں کا علاج کرتا ہے اس نے اجتماعی خدمت تو کی ہے لیکن اجتماعی اصلاح نہیں کی کیونکہ اجتماعی اصلاح کے سلسلے میں معاشرہ کو ایک مخصوص سمت کی طرف موڑنا ایک ڈاکٹر کے بس میں نہیں۔ ان کی یہ خدمت گو کہ اجتماعی اصلاح کے زمرے میں نہیں آتی لیکن اسے کوئی اہمیت نہ دینا بھی قطعاً صحیح نہیں ہے۔ شیخ مرتضیٰ انصاری m اور صدر المتالھین کی خدمات عظیم تر ہیں لیکن ان کے کام کو اصلاح اور ان کو مصلح کا درجہ نہیں دیا جا سکتا مثلاً تفسیر مجمع البیان جو کہ نو سو سال پہلے لکھی گئی اور اس سے ہزاروں انسانوں نے استفادہ کیا، بے شک ایک خدمت ہے لیکن اصلاح اجتماع کے زمرے میں نہیں آتی۔ یہ ایک ایسی خدمت ہے جو کہ ایک عالم نے عالمِ تنہائی میں سرانجام دی۔ کئی ایسے مواقع ہیں کہ کچھ اشخاص نے اپنی ذاتی، نیک اور مثالی زندگیوں میں ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں لیکن انہوں نے معاشرے کی اصلاحی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیا لہٰذا نیک لوگ ایک مصلح کی طرح معاشرے کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ وہ مصلح نہ کہلوانے کے باوجود خدمت کرتے ہیں۔

مندرجہ ذیل جملے میں نے نہج البلاغہ سے ماخوذ کئے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنی پہچان اجتماعی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر ایک مصلح کی صورت میں کروائی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

''اے خدایا: تو خوب جانتا ہے کہ ہم نے کیا کیا! میرا مقصد طاقت کا اظہار اور ذاتی مفاد کا حصول نہیں تھا، بلکہ تیرے ان امور کا احیاء تھا جو تیری طرف لے جانے والی شاہراہ کے سنگ میل ہیں، اس سے تیرے شہروں میں دیر پا اور نمایاں اصلاح کرنا مقصود تھا تاکہ رسوا اور کچلی ہوئی انسانیت کو تحفظ مل سکے اور تیرے ان احکامات کو جن کی پرورش نہیں کی گئی شدت کے ساتھ نافذ کرنا تھا''۔[۱]

امام حسینؑ نے بھی دورِ معاویہ میں دورانِ حج ایک بڑے اجتماع میں جو اہم صحابہ پر مشتمل تھا، اپنے والد کے درج بالا کلمات دہرائے اور اپنا کردار بحیثیت مصلح آشکار کیا۔

امام حسین علیہ السلام نے اپنے بھائی محمد ابن حنفیہ علیہ السلام کے نام وصیت نامہ میں ایک مصلح کی حیثیت سے اپنے اصلاحی کاموں کی تشریح کی، ان میں فرمایا:

انی لم اخرج اشراً ولا بطراً ولا مسفداً ولا ظالماً انما خرجت لطلب الاصلاح فی امة جدی ارید ان امر بالمعروف انهی عن المنکر و اسیر بسیرة جدی و ابی [۲]

''میرا انقلاب ذاتی مفاد کے لئے فساد و ظلم برپا کرنا نہیں بلکہ میں نے اپنے جد امجد کی امت کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے، میرا ارادہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی پہچان کرانا اور میرا مقصد اپنے والد اور دادا کی سیرت پر چلنا ہے''۔

---

[۱] تحف العقول

[۲] بحار الانوار، ج ۴۴ باب ۳۷ ما جری علیه بعد بیعة الناس

اسلامی تاریخ میں اصلاحی تحریکیں

آئمہ ہدیٰ f کی زندگی، تعلیمات، رہبری اور اجتماعی اصلاح کی غمازی کرتی ہیں۔ ان کے علاوہ ہم اسلامی تاریخ میں اور بھی کئی اصلاحی تحریکیں دیکھتے ہیں لیکن چونکہ ان تحریکوں کا مفصل مطالعہ نہیں کیا گیا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی تاریخ ایک جمود کا شکار رہی ہے اور اصلاحی تحریکیں ناپید ہیں۔

ہزاروں سال پہلے مسلمانوں کے اذہان میں ایک خیال ابھرا (پہلے اہلسنت میں پھر اہل تشیع میں) کہ ہر صدی کے شروع میں ایک ''مجدد'' کا دین کے احیاء کے لئے ظہور ہوتا رہا ہے، اہل سنت نے اس روایت کو ابو ہریرہ سے نقل کیا ہے:

''کہ ہر صدی کے آخر میں ایک ایسا شخص آتا ہے جو خدا کے دین کی تجدید کراتا ہے''۔

اگرچہ اس روایت کی پختگی اور تاریخی ثبوت کا تعین نہیں ہو سکا لیکن مسلمان عمومی طور پر اس بات کے متعلق یقین کے ساتھ توقعات رکھتے ہیں اور ہر صدی میں ایک یا ایک سے زیادہ مصلح رونما ہوتے رہے ہیں۔ عملی طور پر یہ صرف اور صرف اصلاحی تحریکیں رہی ہیں۔ اس لئے اصلاح، مصلح، اصلاحی تحریکیں اور حال ہی میں استعمال ہونے والا لفظ ''مذہبی خیالات کی تجدید'' وہ الفاظ ہیں جن سے مسلمانوں کے کان مانوس ہیں۔

اسلامی تاریخ میں اصلاحی تحریکوں کا بغور مطالعہ اور ان کا عملی تجزیہ ان کے لئے مفید اور قوی ثابت ہوسکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ایسے باصلاحیت افراد یہ کام کرگزریں گے اور اپنے مطالعہ اور عملی تحقیق کے نتائج خواہش مند افراد کے سامنے پیش کریں گے۔

یہ ظاہر ہے کہ وہ تمام تحریکیں جن کا مقصد اصلاح ہو ایک ہی طرح کی نہیں رہی ہیں بعض ایسی تھیں کہ ان کا بنیادی مقصد اصلاح تھا اور اس طرح وہ قدرتی طور پر

اصلاحی تحریکیں تھیں، کچھ ایسی تھیں جنہوں نے اصلاح لانے کی آڑ میں فساد برپا کیا اور کچھ ایسی بھی تھیں جو کہ شروع میں اصلاحی پہلو لے کر ابھریں لیکن بعد میں اپنے راستے سے بھٹک گئیں۔

عثمانیوں اور عباسیوں کے ادوار میں علویوں کا ابھرنا بھی اصلاح کا قیام تھا۔ اس کے برعکس بابک خرم دین اور اس قسم کی دیگر تحریکیں اتنی بے ہودہ اور غلاظت اور کثافت اور آلودگی میں ڈوبی ہوئی تھیں کہ اسلام کو ان کی وجہ سے کافی نقصان پہنچا۔ ان کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں عباسیوں کی ظالمانہ حکومت کے خلاف نفرت اور غصہ کم ہو گیا۔ ان تحریکوں کا مقصد شاید عباسیوں کی حکومت کو دوام دینا تھا۔ حقیقت میں ان تحریکوں نے عباسیوں کو مواقع فراہم کئے۔ شعوبیہ کی تحریک کا آغاز بھی اصلاحی تھا، کیونکہ یہ مہم امویوں کی تفریق کی پالیسی کے خلاف تھی اور ان کا نعرہ تھا:

يَآاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ
شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ
اَتْقٰكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾

(سورۃ الحجرات ۱۳)

چونکہ شعوبیہ تفریق کی پالیسی کے خلاف تھے لہٰذا ان کو ''اہل التسویہ'' سے پکارا گیا اور ان کا نعرہ قرآن کی مندرجہ بالا آیت تھا، لہٰذا شعوبیہ کہلائے جانے لگے لیکن بدقسمتی سے وہ خود اس بات کا شکار ہو گئے جس کے خلاف انہوں نے علم انقلاب بلند کیا تھا۔ یعنی وہ نسل اور قوم کی تفریق میں مبتلا ہو گئے، ان کے اس عمل نے عباسیوں کو ایک اور موقع فراہم کیا، شاید عباسیوں نے ایک گھناؤنی سازش کی اور ایرانیوں کو اسلامی عدل کے راستے سے ہٹا کر ایرانی نسل پرستی کے چکر میں ڈال دیا۔ تاریخ میں شعوبیہ کے

انتہا پسند گروپ نے جس شدت کے ساتھ عباسیوں کی حمایت کی ہے وہ اس مفروضے کو تقویت دیتا ہے۔

کچھ اسلامی تحریکیں صرف فکری تھیں، کچھ اجتماعی اور بعض فکری و اجتماعی دونوں پہلو لئے ہوئے تھیں۔ غزالی کی تحریک صرف ایک فکری تحریک تھی اس کے خیال میں اسلامی علوم اور اسلامی خیالات آسیب زدہ تھے۔ اس لئے اس نے ''احیائے علومِ دین'' پر کام کیا۔ علویوں اور سربداروں کی تحریکیں حکومتِ وقت کے خلاف اجتماعی تحریکیں تھیں۔ اخوان الصفاء کی تحریک فکری اور اجتماعی دونوں حیثیتوں کی حامل تھی۔

درج بالا تحریکوں میں چند ترقی پسند تھیں اور کچھ دوسری، مثلاً اشعری چوتھی صدی میں اخباری (شیعوں میں) دسویں صدی میں اور وہابی تحریک بارہویں صدی میں صرف رجعت پسند تحریکیں تھیں۔

ان تمام تحریکوں کو جو کہ عملی یا فکری ہیں یا ترقی پسند اور رجعت پسند ہیں بغور مطالعہ اور وسیع تحقیق کی ضرورت ہے۔ ان کا مطالعہ اس وجہ سے اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ حال ہی میں کچھ موقع پرستوں نے موجودہ خلا سے فائدہ اٹھایا اور انہوں نے اسلامی تاریخ میں تحریکوں کا تجزیہ ذہن میں پہلے سے طے شدہ ''مقصد'' اور ''قیاس'' کے تحت کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اپنی عالمانہ رائے ناسمجھ لوگوں کے سامنے پیش کر سکیں۔

اس وقت ہم ایک مختصر جائزہ میں ان اسلامی تحریکوں کا تذکرہ کریں گے کہ جو پچھلے ایک سو سال سے چل رہی ہیں کیونکہ یہ دور ہماری موجودہ زندگی کے قریب تر ہے۔ ہماری کوشش یہ معلوم کرنا ہوگا کہ ان تحریکوں نے کیا اثرات مرتب کئے ہیں۔

تیرھویں صدی ہجری کے دوسرے نصف اور انیسویں صدی عیسوی میں ایران، مصر، شام، لبنان، شمالی افریقہ، ترکی، افغانستان اور ہندوستان میں اسلامی تحریکیں چلائی گئیں۔ وہ لوگ جنہوں نے مصلح ہونے کا دعویٰ کیا اور اصلاح کرنے کے لئے خیالات اور

نظریات پیش کئے ان ممالک میں نمودار ہوتے رہے ہیں۔ یہ تحریکیں صدیوں کے جمود کے بعد شروع ہوئیں۔ یہ کسی حد تک مغرب کی سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی نوآبادیاتی پالیسیوں کے خلاف تھیں اور اسلامی دنیا میں احیاء اور بعثتِ ثانیہ شمار کی گئی ہیں۔

سید جمال الدین

پچھلے ایک سو سال کی تحریک کے سلسلہ کی بنیادی حیثیت جمال الدین اسد آبادی بہ عرف عام ''افغانی'' کی ہے۔ یہ وہی شخصیت تھی جس نے اسلامی حکومتوں کو ضرورتِ اصلاح اور تشکیلِ نو کے لئے جگایا اور مسلمانوں میں معاشرتی برائیوں کو آشکارا کیا اور ان کو اصلاح کا راستہ دکھا کر ان برائیوں کی اصلاح کا راستہ دکھایا۔ اگرچہ سید کے بارے میں بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے لیکن ان کے فلسفۂ اصلاح کے بارے میں بہت کم بتایا گیا ہے۔ یا شاید میں نے ان کے فلسفہ کے بارے میں سنا اور جانا نہیں ہے تاہم یہ معلوم کرنے سے کافی فائدہ ہوگا کہ سید نے اسلامی معاشرہ کی کن برائیوں کی تشخیص کی اور پھر ان کا کیا علاج تجویز کیا۔ نیز اپنے فلسفہ اصلاح کے مقاصد کے حصول کی خاطر کون سے راستے اختیار کئے۔

جس تحریک کی انہوں نے ابتدا کی وہ اپنی وسعت کے لحاظ سے فکری اور اجتماعی تھی۔ جہاں وہ مسلمانوں کے خیالات میں تجدید چاہتے تھے وہاں وہ نظام زندگی میں بھی احیاء چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو ایک شہر، ایک ملک حتیٰ کہ ایک براعظم تک محدود نہیں رکھا۔ ہر ملک میں تھوڑا تھوڑا وقت گزار کر انہوں نے ایشیا، یورپ اور افریقہ کے طول و عرض میں سفر کیا۔ جس ملک میں بھی وہ گئے وہاں پر لوگوں کے مختلف طبقات کے ساتھ اپنی روحانی وابستگی کافی حد تک استوار کی، حتیٰ کہ کچھ ممالک کے فوجی یونٹوں میں دخل اندازی کی تا کہ افواج میں اثر و رسوخ پیدا کیا جا سکے۔

سید نے بہت سے اسلامی ملکوں کا دورہ کر کے قریبی مشاہدہ کیا جس سے انہیں

ان ملکوں کے بارے میں زیادہ آگاہی ہوئی اس سے ان کو موقع ملا کہ ان ملکوں کی پیچیدگیوں کو سمجھے اور وہاں کی قابلِ عزت شخصیتوں کا گہرا مطالعہ کیا تمام دنیا کا دورہ اور خصوصاً یورپ میں ان کا زیادہ وقت گزارنا اس سلسلہ میں کارآمد ثابت ہوا کہ ترقی یافتہ ممالک میں کیا ہو رہا ہے اور یورپ کی تہذیب کو سمجھنے اور یورپی لیڈروں کے ارادوں کو بھانپنے میں مدد و معاون ثابت ہوا۔ اپنی کوشش اور مشن کے دوران میں سید نے اپنے زمانے اور دنیا کو سمجھا اور اسلامی ممالک کا مناسب اور صحیح علاج بھی دریافت کیا جس کے لئے انہوں نے اپنا مشن شروع کیا تھا۔ سید کے نزدیک اندرونی استبداد اور بیرونی استعمار دو اہم اور توجہ طلب برائیاں تھیں جن سے اسلامی معاشرہ بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ انہوں نے ان کے خاتمہ کے لئے کوششیں کیں اور بالآخر اپنے مشن کی خاطر جان دیدی، وہ یہ ضروری اور ناگزیر سمجھتے تھے کہ ان دو تباہ کن اسباب کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں میں سیاسی بیداری ہو اور وہ سیاست میں بھرپور حصہ لیں۔

اپنی کھوئی ہوئی عظمت کی بحالی اور دنیا میں پروقار مقام حاصل کرنے کے لئے کہ مسلمان بجا طور پر اس کے اہل ہیں، سید اس کو ناگزیر سمجھتے تھے کہ وہ اصلی اسلام کی طرف پلٹیں۔ حقیقت میں وہ مسلمانوں کے نیم بدن میں نئی روح پھونکنا چاہتے تھے، تجدید کی پہلی شرط یہ ہے کہ بدعنوانی کو ختم کرکے تنظیم نو کی جائے اور پھر مسلمانوں میں اتحاد پیدا کیا جائے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ استعماریت آشکارا اور پوشیدہ دونوں طریقوں سے مذہبی اور غیر مذہبی نفاق و انتشار کا بیج بو رہی ہے۔ انہوں نے ان چھپے ہوئے عزائم کو واضح کیا۔

سید کی دو خصوصیات

سید کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شیعہ اور سنی دونوں معاشروں سے بہت زیادہ

آگاہ تھے لہٰذا وہ سنی اور شیعہ دونوں معاشروں کے فرق پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سنی معاشرہ ایک آزاد اور خودمختار ادارہ نہیں ہے اور وہ استبدادی اور استعماری طاقتوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ سنیوں کے مذہبی علماء کا طبقہ حکومتوں سے وابستہ رہا ہے اور وہ صدیوں سے حکومت کو معاشرے کا ''اولوالامر'' کہتا چلا آیا ہے۔ اس لئے سنی معاشرے کے مذہبی علماء کو وہ نظر انداز کردیتے تھے اور براہ راست عوام سے رابطہ رکھتے تھے۔ ان کے خیال میں سنی علماء میں یہ صلاحیت موجود نہ تھی کہ وہ نوآبادیاتی نظام اور استحصال کے خلاف کوئی محاذ بناسکیں اور اس سلسلہ میں اپنا کوئی کردار ادا کرسکیں۔

لیکن شیعہ علماء ایک آزاد ادارہ کی حیثیت سے واضح امتیاز کے ساتھ ایک قومی طاقت ہیں۔ ان کا عوام کے ساتھ گہرا رشتہ رہا ہے اور ہمیشہ حکام کے استبداد کو چیلنج کرتے رہے ہیں۔ اس لئے سید جمال نے سب سے پہلے شیعہ معاشرے کے علماء سے اپیل کی۔ انہوں نے اپنی مہم کا آغاز ذی فہم لوگوں سے کیا اور فیصلہ کیا کہ یہی وہ طبقہ ہے کہ جو ہر آمر اور نوآبادیت کے خلاف جنگ میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

ان خطوط کی عبارت جو انہوں نے شیعہ علماء کو لکھی، خصوصاً مرحوم حاجی مرزا حسن شیرازی اور کئی وہ قراردادیں جو انہوں نے تہران، مشہد، اصفہان، تبریز، شیراز اور دوسرے مذہبی مقامات کی خدا پرست اہم شخصیات کو بھیجیں، اس امر کی کھل کر وضاحت کرتی ہیں۔

سید جمال سمجھ گئے تھے کہ گو شیعہ علماء میں سے چند نے اپنے وقت میں استبدادی طاقتوں کے ساتھ روابط جوڑے، لیکن انہوں نے معاشرے، عوام اور مذہب سے بھی اپنا رشتہ قائم رکھا، دشمنوں کے کیمپوں سے اپنے عوام کی خدمت کی، تاہم کچھ ایسے لوگ تھے جو یقیناً اغیار کے بہت قریب چلے گئے، لیکن ان کی تعداد بہت ہی مختصر تھی۔ تاریخ سے واضح ہے کہ عموماً شیعوں نے اپنے علماء سے اپنا مذہبی رشتہ نہیں توڑا۔

سید جمال کے مشن نے شیعہ علماء کے طبقے پر کافی اثرات مرتب کئے۔ چاہے وہ تمبا کو تحریک ہو جس میں شیعہ علماء نے اندرونی استبداد اور بیرونی استعماریت کے خلاف ایک طوفان کھڑا کیا یا آئینی حکومت کے قیام کی تحریک ہو کہ جس میں بھی شیعہ علماء کی رہبری اور تائید موجود تھی۔

تاریخ میں یہ نہیں ملتا کہ سید جمال الدین نے جو کہ ایک انقلابی مسلمان تھے، شیعہ علماء کو کمزور اور پست کیا ہو، حالانکہ بعض کی لاعلمی اور ناواقفیت کے نتیجے میں ان کو کافی تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔[1]

جناب محیط طباطبائی لکھتے ہیں کہ ''سید نے اپنے یورپ کے پہلے دورہ میں جب وہ وہاں ''عروۃ الوثقیٰ'' رسالہ نکالنا چاہتے تھے یہ محسوس کیا کہ روحانی لوگوں میں اصلاح لانے کی قوت موجود ہے۔ اس بات کو انہوں نے اپنے ایک خط میں واضح کیا جو انہوں نے مصر میں مقیم ایک ایرانی بنام داغستانی کو لکھا (حکومت کو دھوکہ دینے کے لئے انہوں نے اپنا جعلی نام داغستانی رکھا ہوا تھا) اس میں انہوں نے فرمایا کہ:

''علمائے ایران نے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کی ہے، اور یہ ایرانی حکومت ہے جو عوام کے لئے مشکلات پیدا کر رہی ہے، اور ان کے زوال اور تباہی کا سبب بن رہی ہے''۔

تہران میں موجودگی کے وقت علماء کے خلاف کوئی بات نہیں کی جو کہ ان کے مزاج پر گراں گزرے، اس کے برعکس انہوں نے علماء کے ساتھ قریبی روابط رکھے۔ انہوں نے ایک رسالہ ''پنچیریہ'' شائع کیا اس کا عربی ترجمہ بیروت میں ہوا اور چھپ کر تقسیم بھی ہوا۔ ایران آنے پر وہ اس رسالہ کی کچھ کاپیاں اپنے ساتھ لائے اور یہاں

---

[1] نقشِ روحانیت پیشرو در جنبش مشروطیات ایران، تالیف حامد الگیار، ترجمہ: ابوالقاسم سری

صاحبانِ علم و دانش میں تقسیم کیں۔ مذہبی اساتذہ کے ساتھ ملاقات کے دوران شعوری اور لاشعوری طور پر اس بات کا خیال رکھا کہ غرور وخود پسندی کا احساس نہ ہونے پائے۔ سنا ہے کہ جب سید نے مرحوم جناب جلوہ سے پہلی ملاقات کی تو انہوں نے اس بات کے پوچھنے پر کہ ''سید مصر میں شیخ (ابوعلی سینا) کے کلمات پر درس دیتا ہے'' نفی میں جواب دیا تا کہ جلوہ ان کی بات سے مشتعل نہ ہوں۔[1]

سید جمال کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ گو وہ ایسے مصلح تھے جو مسلمانوں کو مغرب کی جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے حصول پر آمادہ کر رہے تھے تا کہ جہالت اور لاعلمی پر قابو پایا جا سکے وہاں وہ جدیدیت میں انتہا پسندی کے خطرہ سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ مغربی سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی اور مسلمانوں کی جہاں بینی اور نظریات کے درمیان ایک توازن برقرار رکھا جائے، وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان مغربی طرز کی جہان بینی پر فریفتہ ہو جائیں اور اسی عینک سے دنیا کو دیکھنے کی کوشش کریں اور یوں اسلامی جہان بینی سے دور ہٹ جائیں۔ وہ نہ صرف مغربی سیاست اور استعمار کے خلاف لڑے بلکہ تہذیبی استعمار کے خلاف بھی سعی کی۔ انہوں نے ان لوگوں کے خلاف مہم چلائی جو کائنات اور قرآنِ مقدس اور اسلامی فلسفہ کی مغربی نقطۂ نظر سے تاویل کرنا چاہتے تھے۔ وہ یہ مناسب نہیں سمجھتے تھے کہ قرآن کے مابعد الطبیعاتی مفاہیم کی انسان کے شعوری اور مادی معاملات کی اصطلاحوں میں تاویل کی جائے۔

ہندوستان کے دورے کے دوران ان کا تعارف ایک مسلمان مصلح سر سید احمد خان سے ہوا۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ مابعدالطبیعاتی مسائل کی علمِ سائنس کے نام اور سائنس کے بہانے سے تشریح کی کوشش کر رہے ہیں کہ غیب اور معقولات کو قابل احساس

---

[1] نقشِ سید جمال الدین در بیداری مشرق زمین، صفحہ نمبر ۳۹ تا ۴۰ اور ۵۲

ومشاہدہ قرار دے کر ان کی تاویل کی جائے اور وہ معجزہ کا ادراک عام اور سادہ معنوں میں کرنا چاہتے ہیں حالانکہ یہ معجزے قرآن میں بڑے واضح ہیں۔قرآن کے آسمانی مفاہیم کو زمینی مفاہیم میں تبدیل کر دیں۔ سید نے ان باتوں پر اعتراض کیا، اس عہد کے ایک مؤرخ نے سید کے ہندوستانی دور کے متعلق اور سرسید احمد خان کے سلسلے میں ان کے موقف کے بارے میں لکھا ہے:

''اگر سید احمد نے مذہب کے اصلاح کے متعلق باتیں کی ہیں تو سید جمال نے مسلمانوں کو فتنہ انگیز مصلحوں اور اصلاح میں انتہا پسندی کے خطرات سے آگاہ کیا جہاں سید احمد نے جدید نظریات کو جذب کرنے کی ہدایت کی۔ وہاں سید جمال اپنے اس استدلال پر قائم رہے کہ صرف مذہبی عقیدہ ہی ان تمام اسباب سے افضل ہے اور اس میں اتنی صلاحیت موجود ہے کہ انسان کی راہِ مستقیم پر چلنے میں رہنمائی کرے۔ اگر سید احمد نے مسلمانوں کو جدید تربیت حاصل کرنے کا شوق دلایا تو سید جمال نے تربیت کے ان نئے طریقوں کو ہندوستانی مسلمانوں کے مذہب اور قوم کے لئے زہر قاتل قرار دیا۔ سید جمال جو کہ نئے نظریات اور تعلیمات کے علمبردار تھے، سید احمد جیسے جدیدیت پسند شخص کے سامنے آئے تو مجبور ہو گئے کہ وہ پرانے خیالات اور نظریات کے سرگرم حامی بنیں تاہم وہ اپنے پہلے نظریے دینی فکری تحریک پر قائم رہے۔

اسلامی سوسائٹی میں جن بیماریوں کی سید جمال نے تشخیص کی وہ یہ ہیں:

۱۔ حکام کا استبداد

۲۔ عام مسلمانوں میں جہالت اور بے خبری اور ان کے کاروانِ علم وتمدن میں

سست رفتاری

۳۔مسلمانوں میں خرافات کا نفوذ اوران کی اصلی اسلام سے دوری

۴۔ مذہبی اور دنیاوی مسائل و معاملات میں مسلمانوں کے درمیان جدائی اور نااتفاقی

۵۔مغربی استعمار کے اثرات

ان بیماریوں کے علاج کے لئے سید جمال نے تمام ممکنہ وسائل بروئے کار لائے، سفر، ذاتی روابط، خطبات، کتابوں کی اشاعت، رسالے اور مختلف پارٹیوں اور گروپوں کومنظم کرنا حتیٰ کہ فوجی ملازمت میں شمولیت ۔ وہ ساٹھ سال زندہ رہے اور ہمیشہ کنوارے رہے اوراہل وعیال سے بے نیاز رہے کیونکہ ان کی زندگی ہمیشہ غیر یقینی تھی ۔ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرتے رہے تھے۔ زیادہ تر وقت جیل، جلاوطنی یا گھر میں نظر بندی کی صورت میں گزارتے تھے۔ اس صورتِ حال میں وہ بال بچوں کی ذمہ داری سے کیسے عہدہ برآ ہو سکتے تھے۔

اوپر دی ہوئی برائیوں کوختم کرنے کے لئے جو تجاویز انہوں نے پیش کیں وہ یہ ہیں۔

ا۔استبدادی حکام کی خودغرضی کے خلاف جنگ

کون یہ جنگ لڑے؟ عوام، لیکن عوام کو کس طرح میدانِ جنگ میں اتارا جائے؟ کیا اس راستے سے کہ ان کو بتایا جائے کہ تمہارے حقوق کو کس طرح پامال کیا جا رہا ہے؟ یہ بجا ہے کہ اس کو بنیادی اہمیت دی جائے لیکن یہ کافی نہیں ،تو پھر کیا کرنا چاہیے؟ بنیادی کام یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں پختہ یقین پیدا کرنا چاہیے کہ سیاسی جدوجہد ایک شرعی اور مذہبی فریضہ ہے۔ یہ واحد راستہ ہے اور لوگ اس وقت تک اطمینان سے نہیں

بیٹھیں گے جب تک وہ اپنے مقاصد حاصل نہیں کر لیتے۔ وہ لوگ غفلت میں ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ سیاست اور مذہب ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ مذہب اور سیاست کی ہم بستگی کو عام لوگوں پر آشکار کرنا چاہیے۔

مذہب اور سیاست میں باہمی رابطہ کی ضرورت پر زور، سیاسی بیداری کا احیاء جو کہ ہر مسلمان کا ایک شرعی فریضہ ہے اور اس کا ملکی سیاست میں عملی شرکت اور ساتھ ہی اسلامی سوسائٹی کا قیام وہ نظریات ہیں جو سید کے نزدیک ان وقتی بیماریوں کا علاج ہیں۔ وہ عملاً اپنے عصر کے استبدادی حکام کے ساتھ لڑتے رہے اور اپنے پیروکاروں کو ان کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے پر اکساتے رہے۔ ناصرالدین شاہ پر حملہ انہی کی تحریکوں کا نتیجہ تھا۔

۲۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سے لیس ہونا

یہ ایک حقیقت ہے کہ سید جمال نے اس سلسلہ میں کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا۔ انہوں نے سکول اور سائنسی ادارے نہیں بنائے، انہوں نے صرف قلم اور زبان سے اس کی تبلیغ کی۔

۳۔ اصلی اسلام کی طرف پلٹنا

اس کا مطلب ان خرافات اور بے کار حاشیہ آرائیوں کا خاتمہ ہے جو اسلام کی لمبی تاریخ کے دوران اس میں شامل کر دی گئی ہیں۔ سید کے نزدیک اسلام کی طرف پلٹنے کا مطلب قرآن سنت کی طرف رجوع کرنا اور دوبارہ اپنے صالح اسلاف کی سیرت پر کاربند ہونا ہے۔ انہوں نے صرف قرآن کی طرف پلٹنا تجویز نہیں کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ خود قرآن، سنت کی طرف رجوع کرنے کو ضروری سمجھتا ہے۔ مزید برآں وہ ''حسبنا کتاب اللہ'' کے جملہ میں موجود تمام خطرات سے بخوبی واقف تھے۔ یہ وہ جملہ ہے جو ہر

زمانے اور دور میں اسلام کے چہرے کو مسخ کرتا رہا ہے۔

۴۔نظریات پر ایمان وعقیدہ

وہ اپنی تحریروں اور خطبات سے مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ چیز بٹھانے کی کوشش کرتے رہے کہ اسلام میں ایک مکتب فکر اور نظریہ کی وجہ سے یہ طاقت موجود ہے کہ وہ مسلمانوں کو اندرونی استبداد اور بیرونی استعمار سے نجات دلا کر ان کو ایک اعلیٰ وارفع مقام پر پہنچا دے۔ مسلمان ارادے کے ساتھ جم جائیں تا کہ وہ کسی دوسرے مکتب فکر کی ضرورت محسوس نہ کریں۔

اس نظریے کی وجہ سے سید نے اپنی تحریروں اور تقاریر میں اسلام کے ان اوصاف پر روشنی ڈالی، مثلاً اسلام میں فکر کی طاقت کا اقرار، مدلل برہان اور مفہوم صراطِ مستقیم پر چلتے ہوئے انسان میں ہر کمال سوائے پیغمبری کے حاصل کرنے کی صلاحیت، انسان کی ذاتی شرافت، اسلام کا سائنسی مذہب ہونا، عمل اور سخت محنت کا مذہب، کوشش اور جدوجہد کا مذہب، فساد کے خلاف اصلاح کا مذہب، حلال وحرام کا مذہب، عزت اور عدم قبولِ ذلت کا مذہب اور ذمہ داریاں قبول کرنے کا مذہب ہونا ہے۔

سید نے اسلام میں نظریہ توحید پر کافی زور دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام صرف برہانی یقینی توحید کو بنیاد قرار دیتا ہے۔ استدلال اور برہانی توحید ہی تمام غلط عقیدوں کے لئے بہت بڑی تردید ہے۔

انہوں نے کہا کہ وہی سوسائٹی فساد اور شرک کو ختم کر سکتی ہے جو استدلال اور برہانی یقین پر اعتماد کرتی ہے نہ کہ وہ جو قیاس، واقعات اور حالات کی موافقت پر یقین رکھتی ہے۔ لوگوں کو استدلال کی تعلیم دی جائے تا کہ فکر کی عزت مذہبی نقطہ نظر سے قائم ہو جائے۔

اس وجہ سے سید نے اسلامی فلسفہ الٰہی کی ضرورت کا احساس دلایا اور ان کے

ماننے والوں نے اس کی پیروی کی۔ انہوں نے ایک بااعتماد شاگرد محمد عبدہ کو فلسفہ پڑھنے کی تلقین کی۔ کہا جاتا ہے کہ محمد عبدہ نے اشارات ابوعلی سینا کی اپنے ہاتھ سے دو کاپیاں تیار کیں اور ایک کے آخر میں سید کی تعریف کی ہے۔ غالباً یہ اسی ہمت افزائی کا اثر تھا کہ عبدہ نے فلسفہ پر کچھ کتابیں شائع کیں۔ پہلی دفعہ نجات بوعلی، البصائر النصیر یہ ابن سھلان ساوجی اور شاید اشارات ابوعلی سینا میں سے المشرقین کے کچھ حصے شائع کئے۔

احمد امین نے اپنی کتاب ظہور اسلام[۱] میں لکھا ہے کہ سنی فکر کے مقابلے میں فلسفہ شیعہ فکر کے ساتھ زیادہ سازگار ہے۔ اپنے نقطہ نظر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ فاطمیوں نے جو مصر کے شیعہ حاکم تھے، فلسفہ کو زیادہ رواج دیا۔ فاطمیوں کے زوال اور سنی روح کے آنے سے فلسفہ مصر سے رخصت ہو گیا۔ حال ہی میں سید جمال (جو شیعی رجحانات رکھتا ہے) کے مصر آنے پر اس خطہ میں فلسفہ کا دوبارہ ظہور ہوا۔

اپنے اس مشن کے دفاع میں کہ اسلام ایک جامع اور آزاد مکتب فکر اور نظریہ رکھتا ہے سید نے یورپی ممالک کے اعتراضات کے خلاف مہم چلائی۔ یورپ میں اسلام کو ایک جبری دین اور قضا اور قدرت کا محتاج تصور کیا جاتا تھا اور یہ کہ اسلام شخصی آزادی کی نفی کرتا ہے اور یہی اسباب ہیں جو کہ اسلام کے انحطاط کا سبب بنے ہیں[۲]۔ وہ یہ بھی تبلیغ کرتے تھے کہ اسلام سائنس کا مخالف ہے اور مسلمانوں کو سائنس سے دور رکھنا اسلام کی تعلیمات میں شامل ہے۔

اپنے رسالہ ''عروۃ الوثقیٰ'' میں انہوں نے ایک مضمون میں اسلام کے نظریہ قضا

---

[۱] جلد نمبر ا صفحہ نمبر ۱۹۰

[۲] انسان و سرنوشت مطہری

وقدرت کا دفاع کیا اور یہ ثابت کیا کہ یہ فلسفہ نہ صرف غیر انحطاطی ہے بلکہ اس نے ترقی اور بلندی میں مثبت کردار ادا کیا ہے[1] اس طرح انہوں نے ایک فرانسیسی سفیر ارنسٹ رنان (Ernest Renan) کا منہ توڑ جواب دیا جو اسلام کو سائنس کا مخالف سمجھتا تھا اور کہتا تھا کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب اسلام ہی ہے[2]۔

۵۔ بیرونی استعمار کے خلاف جنگ

اس کا مطلب اسلامی ممالک کے اندرونی معاملات میں سیاسی دخل اندازی اور اقتصادی استعمار جس میں حصول مراعات کے ظالمانہ نظام کا اجراء اور مسلمانوں کے اقتصادی اور مالی ذرائع کو ختم کرکے تہذیبی استعمار کو لانا اور پھر مسلمانوں کی تہذیب کو برباد کرنا اور ان کو تہذیبی طور پر کمزور بنانا ہے۔ آخر نوآبادیاتی استعمار یہ ہے کہ اس بات کو ثابت کریں کہ صرف مغربی تہذیب ہی ہے جو انسان کی خوشحالی کا سبب بن سکتی ہے۔ تہذیبی استعمار اتنی شدت کے ساتھ پھیلایا گیا کہ ذی فہم مسلمان بھی یہ یقین کرنے لگے کہ اگر کسی مشرقی کو تہذیب یافتہ ہونا ہے تو وہ اہل یورپ کی تقلید کرے۔ وہ یورپی وضع قطع اختیار کرکے ان کی زبان سیکھے، ان کا لباس زیب تن کرے، ان کی عادات، خصائل، اعتقادات، فلسفہ، آرٹ اور تمام دیگر چیزیں اپنائے۔

سید نے دین اور سیاست کی ہم بستگی کو دو محاذوں پر ضروری قرار دیا۔

پہلا محاذ: اندرونی استبداد اور دوسرا: خطرہ بیرونی استعمار۔

انہوں نے انتھک کوشش کی کہ مسلمانوں کے ضمیر کو استبداد اور استعمار کے خلاف بیدار کیا جائے اور اس پروگرام کا ان کے اصلاحی مشن میں اہم مقام ہے۔ اس

---

[1] پائے گزرنهضت هائے اسلامی، سید جمال الدین

[2] رساله اسلام وعلم، از هادی خسروشامی

کے مقابل میں استعمار کے کارندوں نے سیکولرازم اور ''علمانیت'' کے نام پر مذہب اور سیاست کے درمیان دیوار بنانے کی کوشش کی۔ اس مخالف تحریک کی روح رواں کمال اتاترک تھا اور اس کا واحد مقصد سید جمال کے پروگراموں کو چیلنج کرنا تھا۔ عرب دنیا میں سیکولرازم کا پروپیگنڈہ عربی عیسائیوں نے کیا۔ یہ نظریہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ اگر مذہب اور سیاست میں ہم بستگی پیدا کر دی جائے تو عربی عیسائیوں کے لئے کوئی ایسا کام نہیں رہ جاتا جو وہ سوسائٹی میں ادا کر سکیں۔ عرب عیسائی اس میں اکیلے نہیں تھے، بلکہ کچھ مسلمان بھی اس نظریہ میں ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مذہبی روشن خیال اور ذی فہم لوگ بھی ان کے پرجوش طرفدار بن گئے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟

یہ مسلمان حقیقت میں ایک اور بیماری کا شکار تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ سنی دنیا میں خلیفہ اور حاکم ایک ہی ہوتا تھا اور جس کی اطاعت مذہبی فریضہ تھا۔ دین اور سیاست کا ایسا رابطہ بنایا گیا کہ سیاست نے دین کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس لئے ان کا مقصد یہ تھا کہ عثمانی خلیفہ اور حاکم مصر ایک دنیاوی مقام پر فائز سمجھے جائیں نہ کہ دینی، تا کہ لوگوں کا مذہبی اور ملی ضمیر ان پر تنقید کے سلسلے میں آزاد رہے یہ صحیح راستہ تھا۔ سید جمال کے نزدیک دین اور سیاست کی وابستگی کا یہ مطلب نہیں، کواکبی کے بقول:

> ''جو کچھ اس نے تعلیم دی وہ یہ تھی کہ مسلمان عوام اپنی سیاسی سرنوشت میں اپنی شرکت کو ایک مذہبی فریضہ و ذمہ داری سمجھیں۔ دین اور سیاست کی وابستگی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مذہب کو سیاست سے ملایا جائے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاست کو مذہب کے ساتھ ملا دیا جائے''۔

وہ عرب جو سیکولرازم اور دین کو سیاست سے جدا رکھنے کے لئے مہم چلاتے رہے انہوں نے کبھی اس کا انکار نہیں کیا کہ عوام کا سیاست میں شامل ہونا ایک دینی

فریضہ ہے۔لیکن دین اورسیاست کی جدائی کی جو پالیسی اتاترک نے اختیار کی وہ عوام کے لئے بدبختی تھی۔ایران میں بھی ایسا ہی ہوااور عملاً دین کو سیاست سے جدا کر دیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں اس کو اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ پیکرِ اسلام سے اسلام کا ایک عزیز ترین عضو جدا کر دیا گیا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اوپر دیئے گئے مفہوم کے تحت دین اور سیاست کی وابستگی یعنی حکام کو مقدس مقام دینا صرف سنی مکتب کے ساتھ وابستہ ہے۔تشیع اس کو قبول نہیں کرتا اوراس کا وجود ان کی تاریخ میں نہیں ملتا۔ ان کے ہاں ''اولوالامر'' کی تشریح ایسی ہرگز نہیں ہے جو سنیوں نے کی ہے۔

٦۔اسلامی اتحاد

غالباً سید جمال ہی پہلا شخص تھا جس نے مغرب کے خلاف اسلامی اتحاد کا نعرہ بلند کیا۔اسلامی اتحاد کا مطلب مذہبی اتحاد نہیں ہے جو کہ غیر عملی امر ہے۔اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ایک متحدہ سیاسی محاذ بنایا جائے اوراستعماریت کے خلاف متحدہ صف بنائی جائے۔

سید نے مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ مغربی عیسائیوں میں عموماً اور انگلستان میں خصوصاً ابھی تک ''صلیبی روح'' زندہ اورشعلہ زن ہے۔ بے شک مغرب نے تعصب کے خلاف آزادمنشی کا برقعہ پہن لیا ہے لیکن ان کے اندر مسلمانوں کے خلاف تعصب کا ہونا سید کے نزدیک برا نہیں تھا۔تمام دوسری چیزوں کی طرح تعصب بھی افراط وتفریط اوراعتدال پیدا کرتا ہے۔تعصب میں افراط، انسان میں غیر استدلالی، جانبداری اور اندھی تقلید پیدا کرتا ہے جو کہ برائیاں ہیں، اپنے منطقی وعقلی عقائد کی حمایت کے معنی میں تعصب بہت اچھی چیز ہے۔

سید نے فرمایا:

''اہل یورپ جو یہ جانتے ہیں کہ دین ہی وہ واسطہ ہے جو کہ
مسلمانوں کو آپس میں ملاتا ہے اس کو کمزور کرنے کے لئے انہوں
نے (اہل یورپ) تعصب کی مکارانہ مخالفت کی لیکن خود ہر مذہب
اور ہر جماعت سے زیادہ متعصب ہیں۔گلیڈسٹون سینٹ پطرس کی
روح کا ترجمان ہے یعنی صلیبی جنگوں کی یاددہانی کرانے والا۔

سید کے حقیقت پسندانہ خیالات کو اس وقت مزید تقویت پہنچی جب جنگ عظیم اول میں یہودی افواج کے یورپی کمانڈر نے عرب اسرائیل جنگ کے دوران بیت المقدس کو مسلمانوں سے لے کر یہودیوں کی تحویل میں دے دیا اور صیہونی حکومت، اسرائیل کا قیام کرکے یہ اعلان کیا ''اب صلیبی جنگیں ختم ہوگئیں''۔

استعماریت نے قوم پرستی اور نسل پرستی کے بیج بوئے اور مسلمان ملکوں میں ''پان عربی ازم، پان ایرانی ازم، پان ترکی ازم اور پان ہندوازم'' کے نعرے بلند ہونے لگے۔ ایسی پالیسی کے تحت مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان اختلافات کو ہوا دی گئی۔شیعہ سنی جھگڑے ہوئے، دنیائے اسلام کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے بہت سے حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ یہ سب کچھ ''اسلامی اتحاد'' کے خلاف استعماری سازشیں تھیں۔

سید کا مقصد اسلامی سوسائٹی کے نیم مردہ بدن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح مزاحمت اور جہاد کی روح پھونکنا تھا۔انہوں نے مسلمانوں کو بتایا کہ جہاد کے اصول کو دوبارہ اپنائیں کیونکہ اس کا بھولنا ان کے انحطاط کا اہم سبب تھا۔اگر مغربی لوگوں میں صلیبی روح ابھی تک موجود ہے تو مسلمان جہادی روح کو کیوں چھوڑ چکے ہیں؟

کتاب ''سیری در اندیشه هائے سیاسی عربی'' میں منقول ہے کہ:

''سید برطانیہ کو نہ صرف استعماری قوت بلکہ مسلمانوں کا ''صلیبی دشمن'' تصور کرتا تھا۔ان کا خیال تھا کہ برطانیہ کا مقصد اسلام کی مکمل بیخ کنی ہے اور وہ مسلمانوں کا اس لئے

دشمن ہے کہ وہ اسلام کے ماننے والے ہیں۔ یہ برطانیہ کی پالیسی رہی ہے کہ مسلمانوں کا کچھ علاقہ ان سے چھین کر کسی دوسری اسلام دشمن کمیونٹی کو دے دیتا ہے، لہٰذا وہ مسلمانوں کی شکست پر خوش ہوتا ہے اور اپنا مفاد مسلمانوں کی تباہی و بربادی میں دیکھتا ہے۔ برطانیہ کے خلاف مہم میں ان کو اور بھی یقین ہو گیا کہ اسلام مزاحمت اور جہاد کا دین ہے۔ انہوں نے دینی جہاد کے شروع کرنے پر مزید زور دیا۔ ان کے نزدیک اس حکومت کے خلاف جس نے اسلام کو ختم کرنے کا تہیہ کیا ہوا تھا طاقت استعمال کرنے کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں تھا۔

۸۔مغرب کے جاہ وجلال کے خلاف جنگ

انیسویں صدی میں جو واقعات اور تبدیلیاں مغرب میں رونما ہوئی ہیں ان سے اکثر مسلمان ناواقف رہے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی نے یورپ کا چکر لگایا ہوا اور تھوڑا بہت جانا کہ مغرب میں کیا ہو رہا ہے تو ان سے مرعوب ہو گئے اور ان کی ترقی سے بہت بہت متاثر ہوئے۔ مسلمانوں نے محسوس کیا کہ مشرق کے مسلمان مغرب کے عیسائیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور نہ ہی ان کے اندر اتنی طاقت ہے کہ وہ قیام کر سکیں۔ ناصرالدین شاہ نے مغرب کے ایک دورے کے دوران اپنے وزیراعظم کو کہا کہ:

> ''اے وزیراعظم! ہم مغرب تک پہنچنے کی کوشش نہ کریں، آپ نے فقط جو کرنا ہے، وہ یہ ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں کوئی شخص اپنی آواز بلند نہ کرے''۔

سرسید احمد خان جو ہندوستان میں مسلم لیڈر تھے، شروع شروع میں مسلسل برطانوی استعماریت کے خلاف لڑتے رہے۔ یہ بات ان کے دوستوں اور مخالفین دونوں

نے تسلیم کی ہے کہ ۱۲۸۴ ہجری [1] میں پہلے برطانوی دورے نے ان کے ذہن پر کافی اثرات مرتب کئے۔ انہوں نے مغرب کی تمدنی اور سیاسی ترقی، اقتصادی فوجی اور تہذیبی طاقت کا مشاہدہ کیا تو استعمار دشمن خیالات ہوا میں بکھر گئے۔ وہ مغربی تہذیب سے اس قدر متاثر ہوئے اور اس کے رعب و دبدبہ میں آئے کہ یہ گمان کر بیٹھے کہ اس تہذیب کو توڑنا یا اس کے آگے چوں چراں کرنا محال ہے۔ انہوں نے سوچا کہ برطانیہ کے خلاف جہاد کرنا بے فائدہ ہے۔ اس لئے انہوں نے نہ صرف اپنے آپ کو ہندوؤں کی ان کوششوں سے لاتعلق کر لیا جو وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر برطانوی استعمار کے خلاف کر رہے تھے بلکہ مسلمانوں کی تحریک مسلم لیگ جس کے علامہ اقبال بھی ایک کارکن تھے کو بھی سبوتاژ کرنے کی کوشش کی اور مسلم لیگ سے تعاون کرنا چھوڑ دیا۔ انہوں نے رائے قائم کی کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ ہندوؤں کے مقابلہ میں انگریزوں کی خوشنودی حاصل کریں اب بدلا ہوا سرسید مغربی تہذیب وتمدن کا پرچار کرنے والا بن گیا۔ شاید انہوں نے یہ بھی کوشش کی کہ قرآن کی تاویل مغربی مادی نقطۂ نظر سے کی جائے۔

اس کے برعکس سید جمال نہ تو مغربی تہذیب سے متاثر ہوئے اور نہ ہی اس سے مرعوب ہوئے۔ انہوں نے مسلمانوں کو ناامیدی اور مایوسی سے دور رہنے کی تلقین کی اور مغربی استعمار کے خلاف جرأت مندی کے ساتھ جہاد کرنے کے لئے مسلمانوں کو اکٹھا کیا۔ ڈاکٹر حمید عنایت نے لکھا ہے:

> ''سید جمال نے ناامیدی اور مایوسی کے خلاف اپنے جہاد کو اپنے رسالہ ''عروۃ الوثقیٰ'' میں خوب ابھارا۔ وہ یہ رسالہ عربی زبان میں پیرس سے نکالتے تھے۔ یہ بات اس زمانے کی ہے جب برطانوی

---

[1] ہجری ۱۲۸۴ کا سال عیسوی ۱۸۶۳ ہوتا ہے

استعمار ایشیاء میں پوری طرح کامیاب و کامران ہو چکا تھا۔ کئی واقعات مثلاً ایران کی ۱۸۵۶ء میں جنگ ہرات میں شکست، ۱۸۵۷ء میں ہندوستانی بغاوت کی ناکامی اور ۱۸۸۲ء میں مصر پر قبضہ ہو جانا کے رونما ہونے سے مسلمانوں کے ذہنوں میں برطانوی استعماریت ایک ناقابل شکست طاقت کی حیثیت سے جاگزیں ہوگئی۔ سید جمال نے سوچا کہ جب تک مسلمانوں کو ''عقدۂ بیچارگی'' سے آزاد نہ کرا لیا جائے ان کا بیرونی نوآبادیت اور اندرونی استبداد کے خلاف انقلاب برپا کرنا ناممکن ہے۔ انہوں نے اپنا مشن بنایا کہ مسلمانوں میں جہاد کی روح پھونکی جائے۔ انہوں نے مسلمانوں کی صفوں میں مکمل اتحاد و یکجہتی پر زور دیا تاکہ برطانیہ کے توسیع پسندانہ عزائم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جا سکے۔

سید کے اس نظریہ کا اظہار ان کے اس مضمون سے ہوتا ہے جو انہوں نے ''ایک کہانی'' کے عنوان سے اپنے رسالہ ''عروۃ الوثقیٰ'' میں شائع کیا، اس کا خلاصہ یہ ہے:

''شہر التسخیر کے باہر ایک عبادت گاہ تھی، جہاں سے گزرنے والا ہر مسافر رات کے اندھیرے کے ڈر سے پناہ لیتا تھا۔ لیکن جو کوئی بھی عبادت گاہ میں جاتا تو پراسرار موت کا شکار ہو جاتا تھا۔ اس بات نے لوگوں کے دلوں میں خوف و ہراس پیدا کر دیا اور لوگوں نے عبادت گاہ میں پناہ لینی چھوڑ دی۔ آخر کار ایک ایسا شخص جو اپنی زندگی سے عاجز تھا، پختہ ارادے کے ساتھ اس کے اندر گھس گیا، اچانک خوفناک اور ڈراؤنی آوازیں ہر طرف سے آنے لگیں لیکن آدمی ڈٹا رہا اور ہر خوف و اندیشہ کے لئے تیار رہا کیونکہ وہ اپنی زندگی سے تنگ تو آ ہی چکا تھا، اس کے عزم صمیم سے عبادت گاہ کا خوفناک طلسم دھڑام سے گر گیا، عبادت گاہ کی دیواروں میں بڑے شگافوں سے ان کے گنجینے اس

آدمی کے قدموں میں گر گئے تب اس شخص کو معلوم ہوا کہ سابقہ لوگ جس چیز سے قتل ہوئے وہ صرف غیبی خوف تھا، برطانیہ بھی اسی طرح کا ایک عبادت خانہ ہے جہاں بھٹکے ہوئے لوگ سیاست کے اندھیرے سے خوف کھا کر پناہ لیتے ہیں تو دہشت ناک توہمات ان کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کبھی کوئی ایسا شخص جو کہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا ہو لیکن ناقابلِ تسخیر حوصلے کا مالک ہو تو وہ اس طلسمی عبادت گاہ کے اندر داخل ہو کر بلند چیخ کے ساتھ اس کی دیواروں کو پاش پاش کر دے''۔

یہ اسی طرح کی کہانی ہے جو کہ مثنوی مولانا رومی کی تیسری کتاب میں ''مہمانوں کو قتل کرنے والی مسجد'' کے عنوان سے موجود ہے لیکن سید نے اس کو تھوڑے سے رد و بدل کے ساتھ مسجد کی بجائے عبادت گاہ کے نام سے بتایا ہے تا کہ غیر مسلم ماحول میں بھی اس کو سمجھا جا سکے۔

سید کی آرزو

سید نے مسلم سوسائٹی کے لئے جو اصلاحی پروگرام اور معاشرتی نظریہ پیش کیا تھا اگر اس کا خلاصہ پیش کیا جائے تو ''اسلامی اتحاد'' سب سے نمایاں مقام رکھتا ہے۔ نسل، زبان، علاقہ اور گروپ کے اختلافات کو اسلامی بھائی چارہ کی جگہ قطعاً نہیں لینی چاہیے اور مسلمانوں کے تہذیبی، نظریاتی اور روحانی اتفاق میں شگاف ڈالنے کی اجازت کسی صورت نہیں دینی چاہیے۔

سید جمال کے نزدیک مسلم دنیا وہ ہے جہاں کا ہر فرد تعلیم یافتہ اور عالم ہو، عہدِ حاضر کے آئینی و ٹیکنالوجی علوم سے کماحقہ آگاہ ہو اور ہر قسم کی استعماریت اور استبدادیت سے آزاد ہو، وہ چاہتے تھے کہ مغربی تہذیب کو اسلامی تہذیب کا پیروکار بننا چاہیے نہ کہ اس کا الٹ، اسلام کا حاکم اس کے ابتدائی دنوں کے حاکم کی طرح ہونا چاہیے یعنی سادہ اور بغیر پیچیدہ اسباب آرائش و زینت کے جو بعد میں اسلامی تاریخ کے طویل

دور میں ان کے ساتھ مل گئے۔حق کے لئے جہاد کی روح مسلمانوں میں دوبارہ لوٹ کر آئے اور ذاتی عزت ووقار اور دوسرے لفظوں میں استعمار اور استبداد کی نفی ان کی ذات میں پیدا ہو جائے۔

جہاں تک ہمارا خیال ہے سید نے جاگیرداری نظام جو ان دنوں اسلامی سوسائٹی میں موجود تھا کے متعلق کوئی رائے نہیں دی اور نہ ہی اسلامی تعلیمی اور خانوادگی نظام کے سلسلہ میں رائے دی حالانکہ وہ ان سے کافی وابستہ رہے معلوم نہیں کہ سید کے خیال میں ان نظاموں کو اسلام کے طے شدہ معیار کے مطابق کس طرح اپنایا جا سکتا تھا۔ بے شک انہوں نے اپنے زمانے کی استبدادی حکومت کے خلاف بے رحم جنگ لڑی۔لیکن انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ اسلام کے سیاسی فلسفہ کا نقشہ نہیں کھینچا، جس کے ساتھ ان کا متواتر لگاؤ رہا۔اس کی شکل وصورت کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا۔غالباً استعمار واستبداد کے خلاف ابتدائی مہمات میں وہ کافی مصروف رہے اور ان کو ایسا کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ شاید ان کے خیال میں اسلامی انقلاب کے لئے پہلا قدم یہ تھا کہ مسلمانوں کو آمریت اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف مہم میں لگانا چاہیے۔ جب ایک دفعہ وہ اس مہم میں کامیاب ہو گئے تو دوسرا صحیح قدم اٹھانا ان کے لئے مشکل نہیں ہوگا لہٰذا مہم کا دوسرا حصہ سید نے آنے والوں کے لئے چھوڑ دیا۔

سید کی دیگر خصوصیات

سید قدرتی اور اکتسابی دونوں صلاحیتوں کے مالک تھے۔اس قسم کا ملاپ بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے، اس بات کی تصدیق ان تمام لوگوں نے کی ہے جنہوں نے سید کو قریب سے دیکھا ہے۔ لاجواب ذہانت رکھنے کے ساتھ ہی فصاحت اور خطابت بھی عروج پر تھی، ان کی آواز میں جادو تھا، مصر میں ان کی خطابت لوگوں کے ذہنوں میں

طوفان برپا کر دیتی اور لوگ جذبات سے چیخنے چلانے لگتے۔

اکتسابی صلاحیتوں میں سے اہم صلاحیت یہ تھی کہ ان کو صحیح اسلامی تہذیب میسر ہوئی۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم قزوین، تہران اور نجف میں حاصل کی۔ خصوصاً نجف میں انہوں نے اپنے زمانہ کی دو عظیم ہستیوں جناب مجتہدِ اعظم خاتم الفقہاء حاج شیخ مرتضیٰ انصاری اعلی اللہ مقامہ اور نامور فلسفی اور روحانی پیشوا ملا حسین قلی ہمدانی سے فیض حاصل کیا۔ سید نے علومِ عقلی کی تعلیم ان دو شخصیات سے حاصل کی اور یہ دونوں مرحوم بزرگ حاج ملا ہادی سبزواری کے شاگرد تھے، ان کے علاوہ نجف کے دو اہم معزز افراد بھی سید کے دوست بن گئے، ان میں سے ایک سید احمد تہرانی کربلائی اپنے دور کے مشہور عارف اور حکیم بزرگ تھے اور دوسرے سید سعید حبوبی جو عراق کے مشہور شاعر، ادیب، عارف اور مجاہدِ اعظم تھے۔ ان کے انقلابی خیالات نے عراقی انقلاب میں اہم کردار ادا کیا۔ ان دونوں سے سید کی دوستی مرحوم اخوند ہمدانی کے مکتب میں ہوئی۔

سید کے حالات زندگی لکھنے والے ان فلسفیانہ، اخلاقی، تربیتی، سلوکی اور علمی خیالات سے نابلد ہیں جو کہ اخوند ہمدانی کے مکتب میں رائج تھے اور وہ لوگ سید احمد تہرانی کربلائی اور سید سعید حبوبی کے متعلق بھی زیادہ نہیں جانتے۔ وہ لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ سید کے دل و دماغ پر اس مکتب اور ان دو حضرات کا کیا اثر تھا، ان سطور کے لکھنے والے کو جب سید پر ان حضرات کے اثر کا علم ہوا تو سید کی شخصیت کے کئی نئے پہلو سامنے آئے اور ان کی شخصیت کی ایک نئی اہمیت کا پتہ چلا۔

اسلامی تہذیب کے بارے میں وسیع علم کا ہونا اور اس کے عمیق اثرات نے سید کو ہندوستان کے دورے کے دوران یورپی تہذیب کی رو میں بہہ جانے سے بچایا۔

سید کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان کو اپنے زمانے کے تمام علوم پر کافی دسترس تھی۔ وہ کئی دوسری زبانیں مثلاً انگریزی، فرانسیسی اور روسی زبان بھی جانتے تھے۔

انہوں نے براعظم ایشیا، یورپ اور افریقہ کے کچھ حصوں میں سفر کیا۔ ہر مقام پر مناسب قیام کرتے رہے، ان ممالک کی اہم شخصیات، سیاسی حضرات، صاحبان علم و دانش سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں اور ان تمام چیزوں نے سید کی وسیع النظری میں بہت اضافہ کیا۔

ان کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی دنیا کو بہت قریب سے دیکھا، حجاز، مصر، ہندوستان، ایران، ترکی اور افغانستان کا دورہ کرکے تمام اہم لوگوں سے ملاقات کی۔ ہر ملک میں انہوں نے مناسب قیام کیا اور ان کی تحریکوں کا تجزیہ کیا اور ان کی شخصیات اور رجحانات کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس چیز نے سید کو ان غلطیوں سے بچا لیا جس کے دوسرے مصلح مرتکب ہوئے تھے۔

ان کی چوتھی خصوصیت یہ تھی کہ اسلامی ممالک کی سیاسی، اقتصادی اور جغرافیائی حالات کے متعلق ان کی معلومات وسیع تھیں، جو خط انہوں نے مرزا حسن شیرازی کو لکھا اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایران کے اس دور کے مسائل سے پوری طرح باخبر تھے اور ان کو پردۂ سیاست کے پیچھے استعماری چال بازیوں اور عیاریوں کا بھی پورا علم تھا۔

شیخ محمد عبدہ

دوسرا شخص جو سید کے بعد ہماری توجہ کا مرکز ہے، وہ سنی دنیا اور خصوصاً عرب سوسائٹی سے تعلق رکھنے والا مصلح ہے ان کا نام شیخ محمد عبدہ ہے اور وہ سید جمال کے شاگرد ہیں وہ اپنی ذات اور روحانی زندگی کو سید جمال کے مرہونِ منت سمجھتے تھے۔

عبدہ اسلامی ممالک کی بیماریوں کی اس تشخیص سے مکمل اتفاق کرتے تھے جو ان کے استاد نے معلوم کی تھیں وہ تمام چیزیں جو عبدہ کے ساتھ مخصوص ہیں اور ان کے استاد میں نہیں ہیں وہ یہ ہیں کہ عبدہ نے ان مذہبی خیالات میں الجھاؤ کی طرف توجہ دی جو مسلمانوں کے اندر اس وقت پیدا ہوئے جب انہوں نے مغربی تہذیب کے ساتھ مراسم

بڑھائے اور جدید اسلامی دنیا کے مطالبہ پر توجہ دینا بھی ان کی خصوصیت ہے، کئی صدیوں سے مسلمان انحطاط کا شکار تھے اور اب وہ اتنی طاقت محسوس نہیں کر سکتے تھے کہ ان برے حالات کا مقابلہ کریں، سید جمال کو چھوڑ کر مصر واپس آنے پر عبدہ کے ذہن میں سب سے بڑا مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ تقاضائے وقت اور اسلام کے سوال کا حل تلاش کیا جائے اس مسئلہ کے حل کے لئے آپ نے جن دو چیزوں کو ملحوظ خاطر رکھا۔

ایک یہ بات کہ فکری جمود اور علمائے دین کا جعلی نظریہ عقلیت مصری سوسائٹی کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا سبب نہ بنے اور مسلمانوں کی اندرونی اسلامی طاقت خود اپنے خلاف نہ اٹھ کھڑی ہو، جیسا کہ کچھ اسلامی ممالک میں ہوا ہے، دوسری بات یہ تھی کہ اسلام اور سائنس کے مقابلہ میں انتہا پسندی سے بچا جائے اور اسلامی اصولوں کا سودا نہ کیا جائے جیسا کہ ایک گروپ کے ساتھ ہوا، بصورت دیگر عملی طور پر اسلام کی فہم و فراست کو ختم دیا جائے گا۔

سید جمال کے برعکس محمد عبدہ نے اپنی ذمہ داریاں ایک عالمِ دین کی حیثیت سے محسوس کیں، اس لئے اس نے ایسے ضوابط کی تلاش کی جو انتہا پسندی اور افراط وتفریط کے رجحانات کو دبانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

اس نقطہ نظر سے عبدہ نے ایسے مسائل اٹھائے جو کہ سید جمال نے نہیں اٹھائے تھے، مثلا چاروں مذاہب میں فقہ کے مسائل، اجتہاد میں فلسفہ، بنیادی حقوق ،فقہ میں جدید قانونی نظام کی ایجاد جو روزمرہ کی ضروریات پر پورا اترے، عبادات اور دوسرے معاملات میں حد فاصل قائم کرنا یا دوسرے لفظوں میں اخروی روحانی امور کو ایک طرف
معاملات میں حدِ فاصل قائم کرنا یا دوسرے لفظوں میں اخروی روحانی امور کو ایک طرف
رکھنا، مادی زندگی اور دنیاوی امور کو دوسری طرف رکھنا اور یہ کہ فقیہ پہلی قسم میں حق اجتہاد

نہیں رکھتا جبکہ دوسری قسم میں رکھتا ہے، وغیرہ ، دوسرے معاملات جن کے متعلق انہوں نے توجہ دی وہ اجماع تھا کیونکہ اجماع کا اعتبار افکار عمومی کا اعتبار ہے، اسلام میں شوریٰ کا نظریہ جمہوریت کا بنیادی نظریہ ہے جس کو کئی صدیوں بعد مغرب نے اپنا لیا۔

عبدہ نے اپنے استاد کی طرح یہ ثابت کیا کہ اسلام میں ایک مکتب فکر اور رہنما نظریے کی توانائی موجود ہے اور یہ اپنے ماننے والوں کو دنیا و آخرت دنوں کی عزت دے سکتا ہے، انہوں نے ثابت کیا کہ اسلام میں روزہ، نماز، حج زکوٰۃ کے پیچھے کون سا دنیاوی اور اجتماعی فلسفہ ہے اور اسلام کے اخلاقی اصولوں کے استحکام کو واضح کیا۔

انہوں نے اسلامی دنیا میں اتحاد قائم کرنے کے لیے سید جمال کے مشن کو جاری رکھا اور گروپ بندیوں پر سخت مایوسی ظاہر کی، انہوں نے اپنے قول کے مطابق نہج البلاغہ کے کچھ حصوں پر غور و خوض کرنے کے بعد ان کی شرح لکھی، انہوں نے حضرت علیؑ کے کلمات میں پائے جانے والی فصاحت اور بلاغت کی کافی تعریف کی۔

نقاط ایسے ہیں کہ جن پر عبدہ کا سید جمال سے اختلاف ہے، سید جمال نے جہاں انقلاب کی بات کی، وہاں عبدہ نے تدریجی اصلاح کی کوشش کی ہے، دوسرا نقطہ یہ ہے کہ سید جمال کے نزدیک اسلامی معاشرے میں اصلاح لانے کیلئے پہلے استعمار و استبداد کے خلاف جہاد کیا جانا چاہیے جب کہ عبدہ کے خیال کے مطابق (سید جمال کو چھوڑ کر مصر آنے کے بعد) سیاسی تعلیم اور عمل سے پہلے دینی تعلیم و تربیت دینی چاہیے۔

عبدہ کے کام کا خلاصہ ’’عربوں کے سیاسی خیالات کا جائزہ‘‘ نامی کتاب سے درج ذیل ہے:

> ’’مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے سے متعلق سید جمال اور عبدہ کے کاموں کا موازنہ کیا جائے تو کافی کاموں میں وہ ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں‘‘۔

سید جمال ایک مرد میدان اور باعمل انسان تھے لیکن عبدہ مفکر اور میانہ رو انسان تھے، سید جمال کے نزدیک مسلمانوں کیلئے آزادی حاصل کرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ فکری ارتقا کیا جائے جبکہ عبدہ اخلاقی اور دینی تربیت کے حامی تھے، سید کی کوششیں تقریباً تمام دنیائے اسلام پر محیط تھیں، جبکہ عبدہ نے اپنے آپ کو مصری معاشرے تک محدود رکھا، اپنے اس طریق کار کے اختلاف کی وجہ سے یہ دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ نظر آتے ہیں، بنیادی طور پر دونوں اصلی دینی فکر کی طرف مراجعت [1] اور احکام شریعت کی توجیہہ اس طرح کرنا چاہتے تھے کہ وہ موجودہ مسائل سے ہم آہنگی پیدا کرسکیں [2]، دونوں مسلمانوں میں اتفاق اور اتحاد کی کوشش کرتے رہے اور گروہ بندی کے خلاف تھے [3]

دونوں اسلام کی روحانیت کے احیاء اور ارتقاء کی ضرورت پر زور دیتے رہے، خصوصاً ان خشک، روکھے اور ہٹ دھرم علماء کے اندر جو برائے نام علماء ہیں اور حقیقت میں اپنے دور کی حکومتوں کے پٹھو ہیں یہ بنیادی اصول سنی ازم کو جدید بنانے کے لئے بنائے گئے تھے۔

کواکبی

[1] یہ احساس کہ آج کل جو کچھ مسلمانوں کے پاس اسلام کے نام پر ہے، یہ اصلی اسلام نہیں بلکہ تحریف شدہ اور مسخ شدہ صورت ہے۔

[2] یہ احساس کہ مسلمان اسلام کو منطقی اور علمی طور پر سمجھنے کی کوشش کریں نہ کہ نسل درنسل اندھی تقلید کرتے رہیں، اس سے ان کے اندر علمی اور منطقی صلاحیتیں زیادہ ہوں گیا ور اندھی تقلید نہیں کریں گے۔

[3] سید نے کہا کہ وہ دیکھتے ہیں کہ صرف ایک چیز پر مسلمان متفق نظر آتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ان میں اتفاق اور مشترک فکر کا فقدان ہے۔

سنی اصلاحی دنیا کا تیسرا علمبردار شیخ عبدالرحمن کواکبی ہے، وہ صفوی نژاد اور شام کا رہنے والا تھا اور شیخ صفی الدین اردبیلی کی نسل میں سے تھا وہ ترکی اور فارسی زبانیں جانتا تھا اور عبدہ کا براہ راست اور سید جمال کا بالواسطہ شاگرد تھا، وہ شام میں ۱۲۷۱ ہجری میں پیدا ہوا اور زندگی کا زیادہ حصہ اپنے ملک میں ہی بسر کیا۔

کواکبی زندگی کے آخری ایام میں مصر گیا اور چند سال گزارنے کے بعد ۱۳۲۱ ہجری میں ۵۰ سال کی عمر پا کر وہیں فوت ہو گیا۔

کواکبی اسلامی فلاسفر تھا اور وہ استبدادیت کے خلاف اٹھا، وہ ان ترک استبداد حکام کے خلاف برسر پیکار رہا، جو شام پر حکومت کر رہے تھے، کواکبی نے جو دو یادگار چھوڑی ہیں ان میں سے ایک کتاب ''طبائع الاستبداد'' جس کا فارسی ترجمہ ایران میں آئینی تحریک کے دوران شائع ہوا اور دوسری کتاب ''ام القریٰ'' جس میں اصلاح لانے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔

سید کی طرح کواکبی نے بھی سیاسی بیداری کو بنیادی طور پر اہم اور ضروری سمجھا وہ یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ حکومت چاہے وہ آئینی ہو یا کسی اور شکل میں بذات خود حکومت بھی استبدادی شکل اختیار کر سکتی ہے، حقیقت میں استبداد کو روکنے کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ لوگوں میں اجتماعی سیاسی شعور پیدا کیا جائے اور ان کے ضمیر کو جگایا جائے تا کہ وہ حکام پر کڑی نظر رکھ سکیں۔

استبدادیت کے اژدھا کو صرف عوام کے ضمیر کی بیداری ہی دور رکھ سکتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم حکومت وقت کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں، حکومت ہرگز حکومت نہیں جب تک کہ لوگوں کی شعوری سطح بلند نہ ہو، لہٰذا کواکبی، سید جمال کے مطابق لیکن عبدہ کے خلاف اس رائے پر قائم رہے کہ اصلاح کے تمام پروگراموں سے پہلے مسلمانوں کا سیاسی شعور بلند کیا جائے، کواکبی دین اور سیاست کی ہم بستگی کا سخت

سے پابند تھا اور اس کا اعتقاد تھا کہ اسلام دین سیاست ہے اور اگر ''اسلامی توحید'' کو صحیح طور پر سمجھا جائے اور لوگ کلمہ توحید لا الہ الا اللہ کے مفاہیم سے کما حقہ آگاہ ہو جائیں تو وہ استبدادیت کیخلاف قابل تسخیر دیوار بنا سکتے ہیں۔

دو ممتاز پیشرووں (سید جمال اور عبدہ) کی طرح کواکبی بھی اصل توحیدی نظریہ کے اور عملی پہلوؤں پر اعتماد کرتا تھا، وہ کہتا تھا کہ افضل الذکر لا الہ الا اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے اور عبادت کا مطلب خضوع وخشوع ہے، یعنی صرف اللہ ہی کے آگے خضوع خشوع ہے، ہر وہ امر جو اطاعت خدائے بزرگ کے زمرہ میں نہیں آتا وہ شرک اور بت پرستی ہے۔ کواکبی اسلامی توحید کو صرف فکری، اعتقادی اور نظری جو تھیوری پر اختتام پذیر ہو، نہیں سمجھتا تھا بلکہ اس کو عمل اور خارجی مقاصد کی طرف لے جانا چاہتا تھا تا کہ توحیدی نظام کا ٹھوس نظریہ قائم ہو جائے۔

انصاف سے دیکھا جائے تو اسلام کی عملی، اجتماعی اور سیاسی وحدت کی تفسیر علامہ مجتہد اعظم مرزا محمد حسین نائینی مرحوم m سے زیادہ کسی نے نہیں کی، انہوں نے اپنی کتاب ''تنبیه الامة و تنزیه الملة'' میں قرآن اور نہج البلاغہ سے ایسے لاجواب استدلال پیش کئے کہ کواکبی جیسے فلاسفر جن کی تلاش میں رہتے تھے، مرحوم نائینی m نے معتبر اسلامی مدارک اس کتاب میں بہترین انداز سے پیش کئے لیکن بدقسمتی سے ہمارے وقت کی شورش زدہ ذہنیت نے کتاب کے نشر ہونے پر اپنا ایسا ردعمل دکھایا کہ مرحوم نے مکمل خاموشی اختیار کر لی۔

کواکبی کی رائے میں ہر استبدادی حاکم اپنی کرسی کو بچانے کے لئے ''قدسی'' جبہ پہن لیتا ہے اور دینی علوم میں حصہ دار بننے کا بہانہ صرف اس لئے کرتا ہے کہ وہ اپنے مذموم مقاصد حاصل کرے، جو چیز لوگوں کو اس بات سے بچا سکتی ہے کہ ظالم حکام ان کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال نہ کریں وہ یہ ہے کہ عوام کی دینی اور سیاسی شعور کی سطح بہت

ہی بلند ہو۔

کواکبی نے اسلام کے کچھ علمائے سلف (اہل تسنن میں) پر تنقید کی کہ انہوں نے نظم وضبط کے نام پر عدل اور آزادی کا گلا گھونٹ دیا، یعنی انہوں نے امن و امان کے نام پر آزادی میں رکاوٹ کا سبب بن کر ظالم اور استبدادی حکام کے ہاتھ مضبوط کیے، آزادی جو کہ انسانیت کے لئے اللہ پاک کا بہترین تحفہ ہے کو قتل کیا اور عدل کو اپنے پاؤں تلے روندا۔

آزادی اور نظم وضبط کے رابطہ میں کواکبی نے آزادی کو مقدم سمجھا اور اس طرح دین اور سیاست یا دین و آزادی میں دین کو مقدم جانا کیونکہ دین ہی صحیح آزادی (جو سیاسی ضمیر کو بیدار کرتی ہے) کو حاصل کرنے کا اہم سبب ہے، علم اور آزادی یا علم و سیاست کے موازنہ میں کواکبی یقین رکھتا ہے کہ تمام علوم ہمیں آزادی کی رو میں بہا کر نہیں لے جا سکتے اور اجتماعی آگاہی کی سطح پر ان دونوں کو ایک ساتھ نہیں رکھا جا سکتا، لہٰذا استبدادی حاکم کچھ علوم پر عبور نہیں رکھتا وہ خود ان کے رائج کرنے والا بن جاتا ہے لیکن ان تمام دوسرے علوم سے خوف زدہ رہتا ہے جو کہ عوام میں اجتماعی اور سیاسی بیداری پیدا کرتے ہیں، انہوں نے لوگوں کو آمریت اور ظلم کے خلاف آزادی کی جستجو کے لئے بیدار کیا۔

کواکبی کہتا ہے:

> استبدادی حکام علوم لغت اور زبان پر عبور حاصل کرنے کی اس وقت تک مخالفت نہیں کرتے جب تک کہ یہ سننے اور پڑھنے والوں میں حکمت اور شجاعت پیدا نہیں کرتی، وہ جانتے ہیں کہ تاریخ میں حسان کی طرح کم ہی ایسے شاعر ہوتے ہیں جو اپنی سحر بیانی سے لوگوں کے جذبات کو ابھار کر ایک لشکر کی صورت میں دشمن کے مقابلے میں لے جاتے ہیں، منتسکیو اور شیلی دوبارہ پیدا نہیں ہوتے

اسی طرح استبدادی حکام ان دینی علوم مثلاً آخرت، عملی زندگی اور روحانیت وغیرہ کو بھی برداشت نہیں کر سکتے، جو علوم ان کیلئے خطرناک ہیں وہ یہ ہیں۔

1۔علوم حقیقی زندگی۔

2۔فلسفہ عقلی۔

3۔ملک اوراس کی حکومت کا علم۔

4۔تاریخ اور۔

5۔خطابت کا علم۔

وہ ان علوم سے خوف زدہ رہتے ہیں جو جہالت اور بے علمی کے بادلوں کو اڑا لے جائیں اور آفتاب درخشاں ظاہر ہوکر اپنی تابانی سے انسانی دماغوں میں حرارت اور روشنی پیدا کر دے[1]

عرب دنیا کی اصلاحی لہروں میں کمی

یہ تین شخصیات ہی سنی معاشرے میں صرف ایسی ہیں جن کو مصلح کی حیثیت سے پہچانا جا سکتا ہے، ان سے ہماری مراد سید جمال، عبدہ، اور کواکبی ہے، اہمیت کے پیش نظر وہ پہلے، دوسرے اور تیسرے نمبر پر دیئے گئے ناموں کی طرح آتے ہیں، ان کے پیرو کار خصوصاً سید جمال کے، مصر، شام، الجیریا، تیونس، مراکش اور مغرب میں پھیلتے رہے اور انھوں نے سید جمال اور عبدہ، کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے کو مصلح ظاہر کیا لیکن ان میں سے کوئی بھی اپنے اسلاف جیسا مقام حاصل نہیں کر سکا بلکہ ان میں سے بعض اصلاح کی بجائے فساد برپا کرتے رہے اور مصلح کی بجائے فسادی کے نام سے

---

[1] سیری در اندیشھائے سیاسی عرب۔۱۲۹

مشہور ہوئے، اس طرح کا ایک آدمی سید محمد رشید رضا ہے جو اپنے آپ کو سب سے بڑا مصلح کہتا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ صرف وہ ہی سید جمال اور عبدہ، کے مشن آگے لئے جا رہا ہے لیکن اس کے اندر ان دونوں کے خیالات کے اثرات نہیں پائے جاتے اور وہ زیادہ تر ابن تیمیہ اور عبدالوہاب کے افکار سے متاثر تھا، مؤخر الذکر دونوں حضرات مصلح نہیں تھے بلکہ وہابیت کے مبلغ تھے شیعوں کے بارے اس کے مفروضے اور متعصّبانہ رائے نے ثابت کر دیا کہ وہ کسی بھی اصلاحی تحریک کو چلانے کے اہل نہیں ہیں، اصلاح طلبی کی سب سے بنیادی شرط کینہ پروری سے مبرا ہو، رشید رضا اس بنیادی شرط کو پورا نہیں کرتا، اگر وہ تعصب سے اتنا ہی بالاتر ہوتا جتنا کہ اس کا استاد عبدہ، تھا تو یہ بات معجزہ سے کم نہ ہوتی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مندر بالا تین شخصیتوں کے علاوہ عرب دنیا میں اور کوئی اصلاح کا علمبردار کیوں نہ ہو سکا؟ کیوں نہ بعد میں آنے والے مصلح اپنے اسلاف کے مشن کو جاری رکھ سکے؟ ان میں عبدالحمید ابن بادیس جزائری، طائر الزاہردی جزائری سوری، عبدالقادر مغربی، جمال الدین کاظمی سوری اور محمد بشیر ابراہیمی وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے، کیوں اسلامی تحریکوں کی کشش ختم ہوگئی اور اس کے مقابلہ میں قومی اور عربی تحریکیں مثلاً بعثت تحریک، ناصر ازم، سوشلسٹ اور مارکسٹ تحریکیں ابھرنے لگیں اور نوجوان نسل کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہونے لگیں! اس بارے میں ہر شخص اپنی رائے قائم کر سکتا ہے لیکن اس بندہ (مصنف) کی رائے یہ ہے کہ:

اسلامی تحریکوں کی جاذبیت کے کم ہونے کا سب سے اہم سبب یہ ہے کہ سید جمال اور عبدہ کے بعد کے مصلحوں نے وہابیت کا پرچار کیا اور وہابیت کا مسلک تنگ نظری ہے، انہوں نے ان تحریکوں کو ''اسلاف پرستی'' کی نوعیت کا بنا دیا جس میں سابقہ طریقوں کو ابن تیمیہ حنبلی کی پیروی میں لے آئے، حقیقت میں وہ اصلی اسلام کو دوبارہ لانے کی کوشش میں حنبلی مکتب سے آگے نہ جا سکے جو کہ اسلامی مذاہب میں سب سے

زیادہ سطحی ہے، استبداد و استعمار کے خلاف جہاد کی سپرٹ حنبلی عقائد کے مخالفوں کے خلاف جہاد میں بدل گئی، خصوصاً جس کا سربراہ ابن تیمیہ حنبلی تھا۔

اقبال

عرب ملکوں کے علاوہ کہیں کہیں ایسی مصلح شخصیتیں ابھری ہیں جن کو ہم اہم اور برگزیدہ کہہ سکتے ہیں، مثلاً اقبال لاہوری کو بلاشک و شبہ اسلامی دنیا میں ایک مصلح کی حیثیت دی جاسکتی ہے، اس کے اصلاحی نظریات اس کے ملک کی سرحدوں کو پار کر گئے اقبال میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں کچھ نقائص بھی ہیں۔

اقبال کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ انہیں مغربی دنیا کی تہذیب کا وسیع علم حاصل تھا، مغربی فلسفہ حیات اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کے گہری وابستگی رہی جس کی وجہ سے مغرب میں اسے بلند پایہ مفکر اور فلسفی سمجھا جاتا ہے۔

اقبال کی دوسری خوبی یہ تھی کہ مغربی تہذیب کے ساتھ گہری وابستگی اور اس کے وسیع علم کے باوجود وہ مغرب کو ایک جامع انسانی نظریے سے محروم سمجھتا تھا بلکہ اس کو یقین تھا کہ صرف مسلمانوں میں ہی ایسے افراد ہیں جو اجتماعی زندگی میں اصلاح پیدا کر سکتے ہیں اور انسان کی تہذیب کو ایک ضابطہ حیات دے سکتے ہیں، انہوں نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ وہ صرف سائنسی اور معاشی میدانوں میں مغرب کی تقلید کریں لیکن ان کو مغربیت کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔

اقبال نے فرمایا:

''مغربی دنیا نے صحیح طور پر اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، جس کے نتیجے میں ان کے اندر ''میں'' کا عنصر پیدا ہوا اور وہ انا کا شکار ہوئے جو ان کو غلط راستے پر لے گئی، وہ جمہوری راستے تلاش

کرنے کی کوشش میں ہیں لیکن ایسے جمہوری راستے جن میں
امیروں کو فائدہ اور غریبوں کی حالت ابتر ہو، میں یقین سے کہہ سکتا
ہوں کہ آج کل کا یورپ انسانی اخلاقیات میں ایک بہت بڑا کانٹا
بنا ہوا ہے، اس کے برعکس مسلمان بلند ترین اخلاق کے حامل
ہیں اور ان کے اندر روحانی جذبات اٹھتے ہیں۔[1]

اقبال میں ایک اور خوبی یہ تھی کہ وہ ذہنی طور پر ان مسائل کی تلاش میں سرگرداں رہے جس کی تلاش کے لیے عبدہ پریشاں رہے، یعنی کس طرح مسلمان اپنے سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی مسائل حل کریں اور اس کے ساتھ ہی اپنے دین، عقائد اور اصل اسلامی روح کو بھی قائم رکھیں، اس لیے انہوں نے ان مسائل کے حل کے لیے ''اجتہاد'' اور ''اجماع'' پر توجہ دی۔ اقبال نے اجتہاد کو اسلام میں حرکت پیدا کرنے والا انجن قرار دیا۔

اقبال اپنے ان ہم عصروں سے جنہوں نے مغربی ممالک میں تعلیم حاصل کی تھی کچھ مختلف تھے، انہوں نے تصوف، روحانیت اور ماورایت اپنے اندر سمو دیئے تھے، وہ روح اور دماغ کی تقویت کی طرف زیادہ توجہ دیتے رہے، اقبال ذکر وفکر، مراقبہ، عقوبت نفس، تجزیہ نفس جو بالآخر مکمل قناعت اور روحانیت پر منتج ہو، پر زیادہ زور دیتے رہے، یہ تمام چیزیں موجودہ دور کی اصطلاح میں ''محاسبہ نفس یا محاکمہ ذات'' کے نام سے پہچانی جاتی ہیں، جس سے آج کل انکار کیا جاتا ہے، اقبال جہاں مذہبی افکار کی تخلیق نو چاہتے تھے وہاں اگر اس کے ساتھ اسلامی معنویت کا احیاء نہ ہو تو اس کو بالکل بیکار سمجھتے تھے۔ اقبال صرف ایک مفکر نہیں بلکہ صاحب عمل بھی تھے، اس کا ثبوت ان کے اس عمل سے لگتا ہے کہ

---

[1] احیائے فکر دینی، صفحہ نمبر ۳۰۴

وہ مملکت اسلامی پاکستان کے بانیوں میں سے تھے۔

اقبال کی ایک اورصفت یہ تھی کہ وہ ایک زبردست شاعر تھا، اس نے اپنی صلاحیتیں مقصد اسلام کو واضح کرنے کے لیے وقف کردیں، کوابکی نے اس کو ایک شاعر کی حیثیت سے حسان بن ثبات انصاری، کمیت اسدی، دعبل بن علی خزاعی کی صف میں کھڑا کیا ہے اس کی اردو انقلابی نظموں کو عربی اور فارسی میں اس طرح ترجمہ کیا گیا ہے کہ اس کی اصل روح بحال رہے۔

اگرچہ اقبال رسمی طور پر سنی مذہب رکھتا تھا، لیکن وہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہلبیت علیہم السلام کے ساتھ بے پناہ عقیدت رکھتا تھا، اس نے ان کی شان میں ایسی انقلابی اور تعظیمی نظمیں کہی ہیں کہ جو تمام شیعہ شعراء کی فارسی زبان میں شائع شدہ کتابوں میں نہیں ملتیں، تاہم علامہ اقبال کا منتہائے نظر شاعری کرنا نہیں تھا،شاعری کو اقبال نے صرف مسلم معاشرے کو بیدار کرنے کے لیے ذریعہ بنایا۔

اقبال کے فلسفہ کو ''فلسفہ خودی' کا نام دیا گیا، اس کا نظریہ تھا کہ مشرق کا اسلام اپنی اصل حیثیت کھو چکا ہے اور اس کو دوبارہ حاصل کرنے کی ضرورت ہے وہ کہتا ہے کہ جب ایک شخص اپنی شخصیت کو بکھرا ہوا دیکھتا ہے یا اس کو کھو دیتا ہے تو وہ اپنے سے بہت دور چلا جاتا ہے اور خود اپنے لیے بھی ایک اجنبی بن جاتا ہے اور مولانا رومی کے الفاظ میں (اقبال ذہنی طور پر مولانا رومی سے کافی منسلک تھا اور اس کی زندگی پر اس کے کافی اثرات ہیں) اس نے دوسرے لوگوں کی زمین پر گھر بنایا اور بجائے اپنا کام کرنے کے دوسرے کے لیے کام کیا، اقبال نے کہا کہ معاشرہ ایک فرد کی طرح ہوتا ہے جو کہ روح اور شخصیت رکھتا ہے، فرد کی طرح معاشرہ بھی جھٹکے اور ہچکولے کھاتا ہے، یہ ممکن ہے کہ ان جھٹکوں کے نتیجے میں یہ اپنی انفرادیت کھو بیٹھے اور اس کو اپنے آپ پر بھی یقین نہیں رہے، ایسی صورت میں اس کو اپنی ذات پر اعتماد نہیں رہتا اور ذاتی عزت اور خودی کو ختم کر کے

اس وقت زمین پر لڑکھڑانے لگتا ہے جب اس کو مغربی تہذیب اور سوسائٹی سے سامنے لایا جاتا ہے

اقبال کے خیال میں اسلامی تہذیب ایسے مرحلے پر پہنچ چکی ہے کہ بدکاریاں اس کے اندر ناسور کی طرح گھس گئی ہیں اور اس کو تباہی کی طرف لے جا رہی ہیں اور گمان ہے کہ وہ اپنا وجود ہی گنوا دے۔

اقبال کے نزدیک خود شناسی اور خودی، اسلام کی روح اور اہم خاصیتیں ہیں، مصلحوں کے سامنے سب سے اہم اور ضروری کام یہ ہے کہ معاشرے میں یقین اور اعتقاد کو صحیح اسلامی تہذیب، اسلامی روح اور خودی کی شکل میں لایا جائے اور یہی اقبال کے 'فلسفہ خودی' کا نچوڑ ہے۔

اقبال نے اپنے اشعار، مقالات، خطبات اور مجلسوں میں ہمیشہ یہ کوشش کی کہ مسلمانوں کو ان کی کھوئی ہوئی عظمت رفتہ کی یاد دلائی جائے تا کہ یہ امت مجددیت، عظمت، لیاقت، علمیت اور شائستگی کو دوبارہ بحال کرے اور آپ کو دوبارہ ایک 'مومن' بنائے، اس کی کوشش رہی ہے کہ اسلامی تاریخ میں چھپی ہوئی شخصیتوں کے کردار کو منظر عام پر لا کر امت مسلمہ کو ان سے متعارف کیا جائے، اس وجہ سے اسلامی معاشرہ اقبال کا احسان مند ہے۔

اقبال کے اسلامی اصلاحی کارنامے کسی حد تک ان کی آبائی سرزمین سے باہر کی دنیا میں متعارف ہوئے لیکن اس حد تک نہیں کہ جہاں تک سید جمال الدین افغانی نے اپنے مشن کو وسیع کیا، اسی لیے اقبال کے مشن کا زیادہ تر اثر محدود رہا لیکن دو (۲) نقائص اقبال کی شخصیت کو سوالنامہ بنا دیتے ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ وہ اسلامی کلچرل کی گہرائیوں سے پوری طرح واقفیت نہیں رکھتا، مغربی اصطلاح میں وہ بے شک فلسفی تھا لیکن اسے اسلامی فلسفے سے زیادہ آگاہی نہیں تھی، اقبال کا نقطہ نظر فلسفہ اثبات واجب، علم قبل از

ایجاد اور دوسرے علوم الٰہیات کے بارے میں واضح نہیں، اس کا فلسفہ ختم نبوت بھی ختم دین پر اختتام پذیر ہوتا ہے جو کہ بذات خود اقبال کے مدعا اور نظریے کے خلاف ہے جو کہ اقبال کے اسلامی فلسفے کے بارے میں ناواقفیت کی دلیل ہے دیگر علوم اور معارف اسلامی کے بارے میں بھی اس کا مطالعہ سطحی ہے، عرفان کی منزل میں اس کی روح ہندوستانی اور صوفیانہ ہے اور مولانا رومی کا زبردست مرید ہے، اس نے اسلامی عرفان کو اس کی اعلیٰ سطح پر نہ پہنچانا اور عرفان کے گہرے اثرات کی بازگشت سے بیگانہ رہا۔

دوسرا پہلو جس کی وجہ سے اقبال کا فلسفہ تنقید کا نشانہ بن سکتا ہے یہ ہے کہ اس نے سید جمال کی طرح اسلامی ممالک کا وسیع دورہ نہیں کیا تھا لہٰذا وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ ان ممالک کی تحریکوں کا اور ان کی عادات وحالات کا ذاتی علم رکھتا ہے، اس لیے اس نے ان ممالک کی چند شخصیات کے بارے میں اپنی رائے قائم کرنے میں غلطی کی اور استعماری سرگرمیوں کا صحیح اندازہ نہ کر سکا، اقبال نیا اپنی کتاب ''احیائے فکر دینی در اسلام'' میں حجاز کی وہابی تحریک، ایران کی بہائی تحریک، ترکی میں اتاترک کی تحریک کو اصلاحی اور اسلامی کہا ہے۔

اس نے اپنے اشعار میں اسلامی ممالک کے کچھ نااہل ڈکٹیٹروں کی تعریفیں بھی کیں، اقبال جو کہ ایک مخلص مسلمان اور مصلح تھے کی ان غلطیوں کو قابل معافی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

جدید ترکی میں کم وبیش ایسے لوگ نمودار ہوئے ہیں جو اپنے آپ کو مصلح کہتے تھے، اقبال نے احیاء فکر دینی کے سلسلہ میں ضیاء نامی شاعر کے نظریات کئی دفعہ پیش کئے، حقیقت میں ضیاء ایک انتہاء پسند شاعر تھا اور اقبال جیسے وسیع النظر شخص کو اس کے خیالات پیش نہیں کرنے چاہیے تھے۔

شیعوں کی اصلاحی تحریکیں

اب تک ہم نے ایسی تحریکوں کا ذکر کیا ہے جو اہل تسنن نے چلائیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ سید جمال ایران کا باشندہ اور شیعہ تھے لیکن سنی مشن میں اصلاحی تحریکوں کی کہانی سید جمال کو بھی اپنے اندر سمو لیتی ہے، اہل تشیع کی تحریکات جن کا بنیادی مقصد سینوں سے بہت مختلف تھا، مختلف ماحول اور انواع میں ملتی ہیں، اس سوال پر کیا کرنا چاہیے؟ کہ عالم تشیع میں اصلاحی تحریکوں اور اصلاحی پروگراموں کے بارے میں بہت کم سنا گیا ہے، شیعہ تحریکوں کا بڑا مقصد استبدادی اور استعماری طاقتوں کے خلاف مہم چلانا رہا،سنی تاریخ میں ہمیں ایسی کوئی تحریک نہیں ملتی جیسے شیعوں نے داخلی استبدادیت اور خارجی استعماریت کے خلاف چلائیں،مثلاً ایران میں تحریک تمبا کو،جس کی قیادت مذہبی رہنماؤں نے کی، اس تحریک کے نتیجہ میں غیر ملکی دباؤ کو قبول نہیں کیا گیا اور ان (غیر ملکی کمپنی) کو بہت سخت دھچکا لگا، انقلاب عراق جس میں عراقیوں نے انگلستان سے آزادی حاصل کر کے اسلامی مملکت عراق قائم کی، ایران میں آئینی تحریک جس میں استبدادی حکام کے خلاف مہم چلائی گئی اور استبدادی سلطنت کو ایک آئینی حکومت میں بدل دیا اور آخر میں اسلامی تحریک ایران جس کو مذہبی رہنماؤں نے چلایا،شیعہ تحریکیں ہیں۔

یہ تمام تحریکیں شیعہ روحانی رہنماؤں کی قیادت میں چلائی گئیں، ان رہنماؤں نے اصلاحی منصوبے بنا کر ان کو لاگو کرنے کے طریقے دریافت کئے،تمبا کو تحریک ایران کے علماء نے شروع کی، اس کی رہنمائی شیعہ مجہتد آقائے میرزا حسن شیرازی نے کی اور اس کو کامیابی سے ہمکنار کیا، انقلاب عراق کی رہنمائی مجہتد اعظم آقا میرزا محمد تقی شیرازی نے کی، یہ حیران کن بات ہے کہ میرزا محمد تقی شیرازی جیسے متقی، زاہد، محاسبہ نفس کرنے والا اور مصلح اچانک میدان جنگ میں آجائے اور وہ بھی اس طرح کہ گویا اس نے ساری عمر

جنگوں میں گزاری ہو، ایران کی آئینی تحریک کی ابتدائی رہنمائی اخوند ملا محمد کاظم خراسانی اور آقا شیخ عبداللہ مازندانی جو کہ مراجع نجف تھے، نے کی اور بعد میں علمائے تہران سید عبداللہ بہبہانی اور سید محمد طباطبائی نے راہنمائی کی۔

سنی دنیا میں مذکورہ بالاتحریکوں کی جو مذہبی مصلحوں اور روحانی رہنماؤں کی زیر نگرانی چلائی گئیں، نظیر نہیں ملتی اور وہ تحریکیں جو اصفہان، تبریز اور مشہد میں چلائی گئیں ان کی مثال بھی سنی دنیا میں نہیں ملتی، مشہد کی تحریک حاجی آقا حسین قمی کی قیادت میں چلائی گئی۔

آخر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سنی علماء نے کسی تحریک کی قیادت کیوں نہیں کی؟ جب کہ وہ استبدادیت اور استعماریت کے خلاف جہاد کے لیے بہت کچھ کہتے رہے، اس کے برعکس شیعہ علماء ان تحریکوں کی رہنمائی کر کے کامیابی کے ساتھ عظیم انقلاب لے آئے لیکن انہوں نے موجود برائیوں کے متعلق بہت کم سوچا اور ان بیماریوں کے حل کے سلسلے میں بہت کم تجاویز پیش کیں، اسلام کے سیاسی فلسفہ کے بارے میں کم گفتگو کی گئی، ان دو پہلوؤں کی شیعہ اور سنی روحانی نظام میں حیثیت کے متعلق نہایت محتاط مطالعہ کی ضرورت ہے، سنی نظام روحانیت حکام کے ہاتھوں ایک مذاق بن کر رہ گیا کیونکہ سنی علماء نے حکام ''اولوالامر'' کا درجہ دے رکھا تھا۔

اگر عبدہ، جیسی شخصیت مفتی کا عہدہ لینا چاہتی ہے تو اس کو خدیو عباس پر اجازت نامہ چاہیے اور اگر شیخ محمد شلتوت جیسی عظیم المرتبت شخصیت اور مصلح کو جامعہ الازہر کا چانسلر بنانا اسلامی قوانین کے مفتی اعظم کے عہدہ پر بٹھانا مقصود ہے تو جمال عبدالناصر جیسی سیاسی اور فوجی شخص کے آرڈر کی ضرورت ہے۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ سنی روحانیت ایک پابند روحانیت ہے اور اس میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ دوسری پارٹی کیخلاف اٹھے اور لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لے۔ لیکن شیعہ

روحانیت ایک آزاد ادارہ ہے اور وہ اپنی طاقت (روحانی نقطہ نظر ہر دور میں شیعہ روحانیت ایک ایسی طاقت رہی جو مظلوموں کی ڈھارس ہو، لہٰذا پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ سید جمال نے ان ملکوں جہاں سنی آبادی زیادہ تھی براہ راست عوام سے رابطہ قائم کیا لیکن ایران میں جہاں شیعہ آبادی زیادہ تھی علماء کی طرف رجوع کیا، سنی ممالک میں وہ چاہتے تھے کہ عوام کو جگایا جائے لیکن شیعہ ممالک میں علماء ہی انقلاب لانے کی ابتداء کریں، یہی بات ہے کہ شیعہ روحانیت حاکموں کی دسترس سے باہر رہی، اس کی وجہ سے شیعہ روحانیت میں انقلاب لانے کی صلاحیت موجود ہے جبکہ سنی روحانیت میں ایسی صلاحیت موجود نہیں ہے۔

شیعہ روحانیت نے عملاً کارل مارکس کے اس نظریے کو مسترد کر دیا کہ مذہب حکومت اور سرمایہ کی مثلث طول تاریخ میں قائم رہی ہے اور ان تینوں اسباب نے ہم دست اور ہم کار ہو کر عوام کے خلاف ایک طبقے کو جنم دیا اور ان اسباب کیوجہ سے لوگوں میں ذاتی بیگانگی پیدا ہوئی تاہم فلسفی اور اصلاحی پلان کے نقطہ نظر سے شیعہ دنیا میں شخصیتیں ظاہر ہوئیں جنہوں نے خالص اصلاحی نظریات پیش کئے، مثلاً آیۃ اللہ بروجردی علامہ شیخ محمد حسین کاشف الغطاء علامہ سید محسن عاملی، علامہ شرف الدین عاملی اور خصوصا علامہ نائینی، اہل نظر کے لیے یہ بات دلچسپ ہوگی کہ ان بزرگوں کے اصلاحی نظریات کے تجزیہ اور تحلیل کریں، یہ ظاہر ہے کہ یہ نظریات اپنے اپنے پس منظر میں محدود ہیں، میں نے (مصنف) اپنے مقالہ ُمزایاوخدمات آیۃ اللہ بروجردی ' میں ان کے اصلاحی نظریات خصوصاً اسلامی اتحاد کے بارے میں تشریح کی ہے، یہ پورا مقالہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں درج کیا گیا ہے۔

ایرانی اسلامی تحریک

دور حاضر کے صاحبان علم و دانش اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہماری صدی کے دوسرے نصف میں تقریباً تمام یا کم از کم کچھ ممالک میں اسلامی تحریکیں ظاہراً یا خفیہ طور پر ابھرتی رہی ہیں، یہ تحریکیں عملی طور پر سرمایہ داری، استبدادیت اور مادیت پرستی جو کہ استبدادیت کی جدید شکل ہے کے خلاف کام کرتی رہیں، سیاسی ماہرین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ مسلمان جہالت اور ''ذہنی قحط'' کے دور سے گزر کر اپنی ''ہیبت اسلامی'' کی تشکیل کر رہے ہیں تا کہ مغربی سرمایہ دار مغربی اور مشرقی کمیونسٹ کا مقابلہ کر سکیں لیکن کسی بھی اسلامی ملک میں اس تحریک نے اتنی زیادہ وسیع اور عمیق شکل اختیار نہیں کی جتنی ایران میں ۱۹۶۰ء سے شروع ہوئی اور جو ایران میں اس تحریک کی موجودہ شکل ہے اس کی بھی کوئی مثال نہیں ملتی، اس لیے یہ ضروری ہے کہ تاریخ کی اس لاجواب اور بہت اہم تحریک کا مفصل جائزہ لیا جائے۔

اب جبکہ ہمارے عوام اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں، ان کو اس تحریک کی ماہیت سے بے خبر نہیں رکھا جانا چاہیے اب جب تحریک زوروں پر ہے تو یہ بہت ضروری ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں کو ان لوگوں پر واضح کیا جائے جو کہ اس میں کام کر رہے ہیں، یہ ان لوگوں کے مفاد میں ہو گا کیونکہ وہ اس کے مقاصد کے حصول تک جدوجہد کر رہے ہیں، ساتھ ہی شاید یہ تجزیہ ان لوگوں کے لیے بہت ضروری نہیں ہو گا جو ان تمام معاملات کے احاطہ سے باہر ہیں۔

اس وقت جب تحریک اپنے عروج پر ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک میدان جس میں گرد و غبار کا ایک بڑا طوفان آیا ہوا ہو اور اس میں مشاہدہ کرنا یا تصویر اتارنا ناممکن ہو جاتا ہے، یہ صرف اس وقت ممکن ہے کہ جب طوفان گرد و غبار ختم ہو جائے اور مطلع

صاف ہو جائے تا کہ ایک یا زیادہ تصویر بنائی جائیں، بہر حال اس تحریک کا تجزیہ ان لوگوں کے لیے جنہوں نے اس میں کام کیا اور ساتھ ہی ان افراد کے لیے جو اس کے دور رس نتائج کو دیکھیں گے ، بہت مفید ہو گا، میری نظر میں اس کا تجزیہ ان خطوط پر کرنا چاہیے۔

۱۔تحریک کی نوعیت

۲۔تحریک کے مقاصد

۳۔تحریک کی قیادت

۴۔تحریک کے مسائل

۱۔تحریک کی نوعیت

تمام قدرتی واقعات اور حوادث جو اجتماعی اور تاریخی ہوں، وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، تمام تاریخیں تحریکیں نوعیت کے اعتبار سے ایک طرح کی نہیں ہوتیں،اسلامی تحریک '' صدر اسلام '' کی نوعیت کسی بھی طور پر فرانسیسی انقلاب یا روس کے انقلابِ اکتوبر کی طرح نہیں ہے۔

کسی ایک تحریک نوعیت کا تعین مختلف طریقوں سے کیا جا سکتا ہے، مثال کے طور پر ان لوگوں اور گروہوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے جو اس تحریک کے پہیہ کو گھما رہے ہوتے ہیں یا ان راستوں سے بھی اس کی نوعیت کا تعین کیا جا سکتا ہے جو کہ تحریک اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر اختیار کرتی ہے اور وہ آواز بھی جو تحریک میں طاقت اور روحانیت پیدا کر دے،نوعیت کے تعین میں کام کر سکتی ہے۔

ایران کی موجودہ تحریک کسی ایک گروہ یا ٹریڈ یونین کی تحریک نہیں ہے، یہ تحریک ایک مزدور، ایک کسان، ایک طالبعلم، ایک دانشور، ایک صنعت کار، ایک روحانی

عالم کی تحریک نہیں ہے بلکہ یہ تحریک ہر ایک کی ہے اس میں امیر اور غریب، عورت اور مرد سکول کا طالب علم اور استاد، مزدور، کسان غرض یہ کہ تمام طابقوں کی نمائندگی ہے، عظیم مراجع کا ایک اعلامیہ ملک کے طول وعرض پر چھا جاتا ہے اور ہر طبقہ کے لوگ اس کو مانتے ہیں، اس کی آواز شہروں اور دیہاتوں میں یکساں سنائی دیتی ہے، اس کا خراسان اور آذربائیجان کے عوام پر اتنا ہی اثر ہے جتنا ملک سے دور یورپ اور امریکہ میں بیٹھے ہوئے ایرانی طلباء پر اس نے غیر متاثرہ لوگوں میں بھی اتنا ہی جوش و ہیجان پیدا کیا جتنا کہ مظلوم اور محروم لوگوں کے اندر، دونوں طبقوں کے دلوں میں استحصال کے خلاف یکساں نفرت ابھری۔

یہ تحریک ان مفسرین کے رد کے لیے ایک سنہری تاریخی ثبوت ہے، جو تاریخ کی تفسیر مادی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں اور مادیت پرستی کے حامی ہیں اور صرف اقتصادیات ہی کو سوشل ڈھانچہ میں اہمیت دیتے ہیں اور اجتماعی تحریکوں کو طبقاتی کشمکش کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، مادیت پرستوں کا عقیدہ کہ تمام راستوں کا منتہا" شکم" یعنی خوراک کا حصول ہے، اس تحریک کے سامنے ہیچ ہے۔

موجودہ تحریک ان تحریکوں کی مانند ہے جیسی پیغمبروں نے تاریخ انسانیت میں تحریکیں چلائی ہیں جو" الٰہی خود آگاہی" کے لیے تھیں، الٰہی خود آگاہی کی جڑیں انسانی فطرت میں گہری اتری ہوئی ہیں اور یہ ضمیر باطن سے خود پھوٹتی ہیں، پیغمبرانہ پیغام انسان کے فطری شعور کے ان پہلوؤں کو جگاتا ہے کہ اس کا اصل مقام کیا ہے، وہ کس شہر اور دیار سے آیا ہے، یہ احساس اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اندر عجیب اور حیران کن کیفیات اور لگاؤ محسوس کرنے لگتا ہے اور یہ لگاؤ اس کو خدا کے قریب لے جاتا ہے، خدا کی قربت ایک انتہائی سودمند قربت ہے، اس قربت میں تمام اچھی صفات مثلاً خوبصورتی، عدل، کمال، و زیبائی، قربانی، ایثار اور دوسرے کے مفادات کے لیے سوچنا موجود ہیں۔

ہر انسان کے دل میں خدا کی پہچان اور اس کی عبادت کرنے کا جذبہ موجود ہوتا ہے، پیغمبر انسان کے ان احساسات ابھارتے ہیں جو ہر شکل اور مظہر میں بلندی اور بلند درجات کی طرف لے جاتے ہیں، پستی اور کمزوری کے احساسات ختم ہو جاتے ہیں اور انسان کو یہ نظریہ دیتے ہیں کہ وہ سچائی اور صراط مستقیم کی اس لئے پیروی کریں کہ وہ حق اور حقیقت ہیں نہ کہ اس لیے کہ ان کے اپنے ذاتی مفادات اس میں وابستہ ہیں اور باطل کی دشمنی اس لیے کرتے ہیں کہ باطل، باطل ہے۔

ہر نقصان اور فائدہ سے بے نیاز عدالت، انصاف، درستی اور سچائی، خدائی ہیں جو خود نصب العین اور مقصود کی صورت میں آتی ہیں، یہ صرف تنازعہ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے اوزار نہیں ہیں۔

جب کسی انسان میں خدائی بیدار ہو جاتی ہے تو انسانی اعلیٰ اقدار اس میں بصورت نصب العین آ جاتی ہیں تو وہ ایک شخص کا طرفدار صرف ایک شخص کے عنوان سے یا ایک شخص کا دشمن صرف ایک شخص کے عنوان سے نہیں رہتا اور وہ عدل کا طرف دار ہوتا ہے، نہ کہ عادل کا وہ ظلم کا دشمن ہوتا ہے نہ کہ ظالم کا اسکی عادل کی طرف داری اور ظالم سے دشمنی نفسیاتی اور ذاتی دباؤ کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ اصولی اور مسلکی ہوتی ہے۔

جو اسلامی وجدان ہماری معاشرے میں پیدا ہوا ہے وہ اسلامی اقدار کی جستجو کے لیے ہے، یہ وجدان تمام جماعتوں کا مشترکہ وجدان ہے اور تمام طبقات کو ہم آہنگ کر کے ایک ہی سمت میں چلا رہا ہے۔

اس تحریک کی جڑیں ہمارے ملک میں اس صدی کے آخری حصہ میں ہونے والے واقعات سے جا ملتی ہیں اور ان حالات میں جہاں ان واقعات نے ہمارے معاشرے کی اسلامی اقدار سے الجھنے کی کوشش کی، یہ ظاہر ہے کہ ہمارے ملک میں آخری نصف صدی میں ایسے واقعات رونما ہوئے جنہوں نے اسلامی اقدار کی مخالف سمت

اختیار کی اور جن کا مقصد یہ تھا کہ ان مصلحوں کی لائی ہوئی اصلاحوں کو سبوتاژ کیا جائے جو بیسوی صدی کے آخر میں چلائی گئیں، ایسے حالات بغیر کسی شدید ردِعمل کے زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتے تھے۔

ایران میں نصف صدی کے آخیر میں کیا ہوتا رہا ہے، اس کو مختصراً مندرجہ ذیل صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ مکمل استبدادیت اور ہر قسم کی آزادی کا خاتمہ، جدید نوآبادیاتی نظام کا نفوذ۔

۲۔ استعمارِ نو کا نفوذ، یعنی ایک خطرناک اور ناقابل دید صورت میں سیاسی اقتصادی اور تہذیبی استعمار کو نافذ کرنا۔

۳۔ دین اور سیاست میں دوری پیدا کرنا۔ بلکہ دین کو میدانِ سیاست سے بالکل الگ کر دینا۔

۴۔ ایران کو زمانہ جاہلیت قبل از اسلام کی طرف لے جانے اور مجوسی تہذیب کے اجراء کی کوشش، محمدی ہجری کی مجوسی کیلنڈر میں تبدیلی ہے۔

۵۔ اسلامی بیش بہا تہذیب میں تحریف اور تبدیلیاں لا کر اس کو موہوم ایرانی کلچر میں تبدیل کرنا۔

۶۔ ایرانی مسلمانوں کو بے دریغ قتل کرنا اور سیاسی لیڈروں کو جیلوں میں اذیتیں دے دے کر مارنا۔

۷۔ نام نہاد اصلاح کے باوجود معاشرے میں طبقاتی تفاوت کا پیدا کرنا۔

۸۔ غیر مسلموں کو مسلمانوں پر حکومت اور دیگر تمام شعبوں میں فوقیت دینا۔

۹۔ اسلامی قوانین اور اقدار میں یا تو براہ راست تحریف کرنا اور ختم کرنا یا لوگوں کی کلچرل اور سوشل زندگیوں میں فساد کی ترویج اور اشاعت کی شکل میں اسلامی قوانین کا خاتمہ کرنا۔

۱۰۔ ادبیات فارسی کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا اور یہ جتلانا کہ فارسی زبان کو بیرونی اصطلاحات سے نجات دلائی جارہی ہے (حالانکہ وہ اس فارسی ادب کو تباہ کررہے تھے جو ہمیشہ اسلام کا محافظ و نگہبان رہا ہے)

۱۱۔ اسلامی ممالک کے ساتھ روابط کم کرنا اور غیر ممالک کے ساتھ استوار کرنا، اسلام دشمن ممالک جیسے اسرائیل کے ساتھ تعلقات بڑھانا۔

ان حالات نے جو تقریباً آدھی صدی تک رہے، ہماری سوسائٹی کے مذہبی ضمیر کو زخمی کیا اور بحران کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔

دوسری طرف بین الاقوامی سطح پر ہونے والے واقعات نے مغربی لبرل ازم اور مشرقی سوشل ازم کے جھوٹے سیاسی پروپیگنڈہ کو بے نقاب کردیا، روشن خیال طبقات کو جو امیدیں ان دونوں سے تھیں وہ ناامیدی اور مایوسی میں تبدیلی ہوگئیں، انہی حالات میں پچھلے چند سالوں سے اسلامی محققین، ناقدین، سکالرز، مصنفین اور مؤلفین اس مشن میں کامیاب ہونے لگے کہ نوجوان نسل کو اسلام کی دلکش اور کارآمد تعلیمات سے آگاہ کیا جائے۔

ایران کے بہادر اور جوشیلے مذہبی رہنما عرصہ سے ان زیادتیوں کی وجہ سے مغموم وفکر مند تھے اور اس موقع کی تلاش میں تھے کہ کب انقلاب کے لیے اٹھا جائے، ظلم اور دباؤ کی چکی میں پچھلے پچاس سال سے پسنے والی قوم نے جو مغرب پسند اور مشرق پسند کے پروپیگنڈہ میں محصور تھی، یک لخت اسلامی تعلیمات کی آواز پر لبیک کہا اور متحد ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی، ایرانی اسلامی تحریک میں یہ اسباب کافی کارگر ثابت ہوئے۔

اسلامی انقلاب کے نعرے نے تمام ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، شہروں، قصبوں، دیہاتوں اور دور دراز علاقوں میں رہنے والے لوگوں کو کسی ایک لائن کا انتخاب نہیں بتایا گیا ہے، کسی ایک نعرے کا انتخاب بھی نہیں کرایا گیا لیکن ان تمام نعروں سے لوگوں کی آشنائی ان کے اندر صرف اسلامی ضمیر کے بیدار ہونے پر ہوئی، کیا ان نعروں

میں کوئی ایک نعرہ بھی بتایا جا سکتا ہے جو کہ غیر اسلامی ہو؟

تحریک کے مقاصد

یہ تحریک کن مقاصد کے حصول کے لیے چلائی گئی اور یہ کیا چاہتی ہے؟ کیا یہ ڈیموکریسی چاہتی ہے؟ کیا یہ ہمارے ملک سے استعماریت کو ختم کرنا چاہتی ہے؟ کیا یہ انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے ابھری ہے؟ کیا یہ نسلی امتیاز سے چھٹکارا حاصل کرنے اور مساوات کے لیے چلائی گئی ہے؟ کیا یہ استبدادیت کو ختم کرنے کے لیے ہے؟ اور کیا یہ مادیت پرستی کے اثر کو زائل کرنے کے لیے ہے؟ وغیرہ وغیرہ

تحریک کی نوعیت کے پیش نظر جو بتائی جا چکی ہے اور ان اعلانات اور بیانات کی روشنی میں جو اس تحریک کے رہنما گاہے بگاہے دیتے رہتے ہیں، مندرجہ بالا سوالات کا جواب ''ہاں'' اور'' نا ''دونوں صورتوں میں دیا جا سکتا ہے۔ ''ہاں ''اس لیے کہ اوپر دیئے گئے تمام مقاصد اس تحریک کے ہدف میں اور ''نہ'' اس لیے کہ یہ تحریک ایک مقصد میں محصور نہیں ہے، اسلامی تحریک کسی صورت میں بھی محدود نہیں ہوتی کیونکہ اسلام ایک ''نا قابل تقسیم کل ''ہے اور اس کے متعلق کچھ مقاصد کے محسوس کر لینے سے اس کا کردار ختم نہیں ہو جاتا ہے۔

تا ہم اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ اسلام موقع شناسی کے پیش نظر کچھ مقاصد کو دوسروں پر فوقیت نہیں دیتا اور مختلف مقاصد کے حصول و مراحل کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتا ہے، کیا اسلام خود موقع شناسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے بتدریج نہیں آیا ہے؟ آج تحریک نفی و انکار کی منزل پر ہے اور استبداد و استعمار پر کاری ضرب لگا رہی ہے، کل جب تحریک یہ مرحلہ طے کر کے اثبات اور تعمیر نو کی منزل آئے گی، تو دوسرے مسائل توجہ طلب ہوں گے۔

اس مضمون کے شروع میں ہم نے حضرت علیؑ کے اصلاحی مقاصد کا تذکرہ کیا تھا

، جو نہج البلاغہ میں پائے جاتے ہیں ہم نے یہ بھی بتایا کہ اصلاحی مقاصد کا اسی طرح کا نظریہ ان کے بیٹے حسینؑ کا بھی تھا، امام حسینؑ نے عہد معاویہ میں ایام حج کے دوران صحابہ اور ممتاز شخصیات کے ایک اجتماع میں خطاب کرتے ہوئے اس نظریہ کی تشریح کی۔ انہوں نے جو اصلاحی مقاصد بیان فرمائے وہ تمام اسلامی تحریکوں پر حاوی ہیں، ہر دور میں کسی نہ کسی اسلامی تحریک نے مقاصد میں سے کسی خاص جز یا فرع کو لیا ہے۔ انہوں نے کلی مقاصد ان چار جملوں میں ارشاد فرمائے:

۱۔ لنرد المعالم من دینك (نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۱۳۱)

خدا کے راستے کی محو شدہ نشانیوں کو جن کے بغیر اسلام کی پہچان نہیں ہوسکتی واپس لایا جائے یعنی اسلام کے بنیادی اصولوں کی واپسی اور اسلام حقیقی کا احیاء بدعتوں کا خاتمہ کر دینا چاہیے اور اصل سنت کو دوبارہ جاری کیا جانا چاہیے، دوسرے لفظوں میں خود اسلام کے اندر فکری، روحی اور ضمیری اصلاح لائی جانی چاہیے۔

۲۔ نظھر الاصلاح فی بلادك (نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۳۱)

وہ بنیادی حقیقی اور دوررس نتائج کی حامل اصلاح لائی جانی چاہیے جو ہر مشاہدہ کرنے والے کی توجہ مبذول کرائے، لوگوں کی زندگی میں بہبود و بہتری کی علامات نظر آئیں یعنی خلق خدا کے اندازِ زندگی میں بنیادی تبدیلیاں لائی جائیں۔

۳۔ فیاء من المظلو مون من عبادك (نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۳۱)

خدا کے مظلوم بندوں کو ظالموں کے شر سے پناہ دی جائے، ظالموں کے ظلم سے چھٹکارا حاصل کیا جائے، یعنی انسانوں کے اجتماعی رابط میں اصلاح کی جائے

۴۔ تقام المعطله من خدودك (نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۳۱)

خدا کے معطل شدہ مقررات اور اسلام کے قوانین کو جن میں نقص پیدا کر دیا گیا ہے، دوبارہ اصلی حالت میں لانا، اسلامی حدود اور قوانین کے ذریعہ لوگوں کی اجتماعی

زندگی پر اسلام کی حاکمیت بحال کرنا، یعنی مدنی اور اجتماعی معاملات میں اسلامی نظام قائم کرنا ہے۔

ہر مصلح جو اوپر دیئے گئے چار اصولوں پر عملی جدو جہد کے ذریعے اس قابل ہوا کہ لوگوں کے اذہان کو اصلی اسلام کی طرف لے جائے اور بدعتوں اور اخرافات کا خاتمہ کر دے جس نے عمومی زندگیوں میں اصلاح کر کے خوراک، مکان، طبی امداد اور تعلیم مہیا کی ہمسائیگی کو برقرار رکھا اور جو معاشرے کو ایسا نظام حکومت دے جو خدائی اور اسلامی حاکمیت اور انتظام حکومت پر مبنی ہو تو یقیناً اس نے بحیثیت ایک مصلح انتہائی کامیابی حاصل کر لی۔

قیادت

کوئی تحریک بغیر قیادت کے کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی لیکن جب ایک تحریک اسلامی ہو اور اس کے مقاصد بھی کلی طور پر اسلامی ہوں تو اس کی قیادت کون سا لیڈر کرے؟ یا کون سا لیڈروں کا گروپ کرے؟

سب سے پہلے قیادت کو ان تمام شرائط پر پورا اترنا چاہیے جو کہ اس کے کام کے متعلق ہوں، پھر رہنما مکمل طور پر اسلام شناس ہونے چاہیں اور انہیں اسلام کے اخلاقی، اجتماعی، سیاسی اور معنوی فلسفہ سے کما حقہ آگاہ ہونا چاہئے، وہ اسلام کے فلسفہ جہاں بینی سے مکمل واقفیت رکھتے ہوں، وہ ہستی خلقت، مبداء اور خالق ہستی اور ہستی کے بارے میں مکمل اور عمیق آگاہی رکھتے ہوں، یہ بہت ضروری ہے کہ یہ رہنما فرد کے معاشرے کے ساتھ روابط کے سلسلہ میں اسلامی آئیڈیالوجی کے بارے میں ایک واضح ذہن رکھیں کہ انسان معاشرہ بنانے میں کیا کردار ادا کرتا ہے، وہ معاشرے میں کن چیزوں کو عزیز رکھتا ہے اور کن چیزوں کے خلاف ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے آخری مقاصد کیا ہیں اور وہ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے کون سے راستے استعمال کرتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ صرف وہ اشخاص قیادت کر سکتے ہیں جن کی رسومات سے آزادی اسلامی معاشرہ میں پرورش ہوئی ہو اور جو قرآن، سنت، فقہ اور معارف اسلامی سے مکمل آگاہی رکھتے ہوں، لہٰذا صرف مذہبی اور روحانی قائدین ہی اسلامی تحریکوں کی قیادت کر سکتے ہیں۔

تقریباً ایک سال اور آٹھ مہینے قبل (بارہویں محرم کی شب ۱۳۹۶ھ) میں ایک مسلم خواتین اور مردوں کے اجتماع میں مدعو تھا، میں نے پہلے نہیں سوچا تھا کہ یہ اجتماع ایک درجن سے زیادہ خصوصی دوستوں پر مشتمل ہوگا، کچھ صاحبانِ نظر اور اسلامی مفکرین بھی وہاں موجود تھے، آج ان میں سے کچھ ایران سے دور ہیں کچھ جلاوطن کر دیئے گئے ہیں اور کچھ فوت ہو چکے ہیں، موقع و محل کے پیش نظر کیوں کہ یہ اجتماع مسلمانوں پر مشتمل تھا اور سننے والے تمام اسلامی مذہبی معاملات میں دلچسپی رکھتے تھے، لہٰذا تمام خطباء اور خود مجھ سے التجاء کی گئی تھی کہ ہم ایسی تقریریں کریں کہ شرکاء کو کچھ فائدہ پہنچے۔

میں خود کشش و پنچ میں گرفتار تھا کہ موضوع سخن کیا ہونا چاہیے، خصوصاً اس بات کی وجہ سے کہ یہ تقریر ٹیپ ہونی تھی اور بعد میں طلباء میں تقسیم کی جانی تھی، اچانک سننے والوں میں سے ایک غیر ذمہ دار آدمی نے ایک بات کہی اور وہی میرا موضوع سخن بن گیا اس کی بات کا خلاصہ یہ ہے:

''لوگوں کو ان علوم (اسلامی معارف) کے شر سے نجات دلائی جائے۔''

اس وقت میں ان باتوں کو یاد کرنے کی کوشش کروں گا جو میں نے اس سوال کے جواب میں کہی تھیں، کیوں کہ یہ باتیں ہمارے موضوع کے متعلق ہیں۔

ارسطو نے فلسفہ کے بارے میں یہ جملے کہے ہیں کہ اگر تم فلسفی بننا چاہتے تو اپنے آپ کو فلسفیانہ رنگ میں رنگو اور اگر تم فلسفی نہیں بننا چاہتے تو بھی اپنے آپ کو فلسفی رنگ میں رنگو، اس کی وضاحت میں اس طرح کروں گا کہ ارسطو نے کہا کہ اگر فلسفہ صحیح

ہے تو اس کی تائید کرو، اور اگر غلط ہے تو اس کا انکار کرو، اگر فلسفہ قابلِ تائید ہے تو چاہیے کہ فلسفی ہو کر فلسفیانہ انداز میں اس کی تائید کرو اور فلسفہ نا قابلِ تائید ہے تو چاہیے کہ فلسفی بن کر فلسفیانہ انداز میں اس کی تردید کرو، اس وجہ سے ہر حالت میں فلسفے کا جاننا ضروری ہے اور کسی فلسفہ کا انکار بھی فلسفہ کی ایک قسم ہے وہ لوگ جو کچھ علوم کو اس طرح حاصل کر لیتے ہیں کہ ان کے علوم کا فلسفیانہ غور و فکر سے کوئی باہمی رشتہ نہیں ہوتا اور فلسفہ کی نفی کرنے لگتے ہیں تو وہ بہت سخت غلطی میں مبتلا ہیں۔

اس بات سے قطع نظر کہ علماء اسلام نے ہزاروں سال کے عرصہ میں انسانی معاشرہ، تمدن جہاں کے معارف، علوم ریاضیات، علوم طبیعات، علوم انسانی، فلسفیانہ علوم، قانون اور ادبیات کے سلسلہ میں کوئی خدمت کی ہے، یا نہیں حالانکہ بلا شک و شبہ انہوں نے خدمت کی ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ جو ہماری فقہ، ہمارا فلسفہ، ہمارا فلسفۂ زندگی، فلسفۂ تعلیم و تربیت، اخلاقیات، تفسیر، احادیث، ادبیات اور ہمارے قوانین کو قبول کرتا ہے تو وہ ایک فقیہ بنتا ہے، ایک فلسفی بنتا ہے اور ایک عارف بنتا ہے اور اگر وہ اس کی نفی کرتا ہے تب بھی اس کو ان علوم کو سمجھنا چاہیے اور ان کو اکٹھا کر کے سوچ بچار کے بعد ان کی تردید کرنا چاہیے، یہ قطعاً صحیح نہیں ہے کہ ایک آدمی جو فلسفہ اور فقہ کی ایک کتاب کے متعلق کچھ نہیں جانتا، وہ صرف کتاب کو دیکھ کر ہی اس کی تردید کر دے۔

میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہوں گا کہ ہماری تحریک عملاً عروج پر ہے، کسی اجتماعی تحریک کے لیے ضروری ہے کہ فکری اور کلچرل تحریکیں اس کی پشت پناہی پر ہونی چاہیے، بصورت دیگر معاشرتی وابستگیاں اس پر حاوی ہو کر اس اجتماعی تحریک کو جذب کرنا شروع کر دیتی ہیں اور اس کا رخ موڑ دیتی ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ اسلامی تمدن کی دولت سے ناواقف تھے اور مکھی کی طرح دوسرے معاشروں کے جالے میں پھنس گئے ہیں، دوسری طرف وہ اسلامی معاشرتی تحریک جو ہماری اپنی

اجتماعی تحریک سے نکلی ہے وہ اپنے قدیمی کلچر سے مستفید ہوتی ہے اور دوسرے خارجی کلچر سے متاثر نہیں ہوتی، یہ ہمارے لیے کافی نہیں ہوگا کہ ہم اسلام کی تحریک کو اس طرح چلائیں کہ دوسرے کلچروں کی اینٹوں سے اپنے کلچر کی عمارت کی تعمیر کریں، مثلاً ہم مارکس ازم، یا دوسرے نظریات کو دیکھیں اوران کو اسلام میں ملانے کی کوشش کریں، اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم صرف اسلام کی ہدایت نہ کریں بلکہ اسلام کے فلسفہ اخلاق، فلسفہ تاریخ، فلسفۂ سیاسیات، فلسفۂ اقتصادیات، فلسفۂ دین، فلسفۂ الٰہی جو اسلامی تعلیمات کے متن میں موجود ہیں کی تدوین کریں اور ہمارے افراد ان کو اختیار کریں۔

قیادت کی اہمیت پر مزید روشنی ڈالنے کے لیے یہ کہتا ہوں کہ آج ہمیں خواجہ نصیرالدین طوسی، ابوعلی سینا، ملا صدرا، شیخ انصاری، شیخ بہائی اور محقق حلی جیسے بزرگ علماء کی ضرورت ہے لیکن یہ علماء ہم ایسے نہیں چاہتے جیسے وہ اپنے اپنے ادوار میں تھے بلکہ اوپر دیئے ہوئے علماء عصر حاضر کے مزاج کے مطابق ہونے چاہئیں اور انہیں اس دور کے تمام احساسات سے بخوبی واقف ہونے چاہئیں۔

میں اپنے سوال سمجھانے کے لیے مزید کہوں گا کہ کچھ نوجوانوں نے جو ولولہ انگیز جذبہ ایمانی رکھتے ہیں مجھ سے رائے طلب کی کہ وہ یونیورسٹی کی تعلیم کو فوراً ختم کر کے اسلاف کی تعلیمات سیکھنا چاہتے ہیں لیکن میں نے ان سے اتفاق نہیں کیا اوران کو نصیحت کی کہ وہ یونیورسٹی کی تعلیم ادھوری نہ چھوڑیں بلکہ اس کو مکمل کر کے پھر اپنی پسند کی لائن اختیار کریں، میں نے ان سے کہا کہ ان میں سے کچھ تعلیم مکمل کرنے کے بعد سائنسی علوم کے خاص خاص شعبوں میں مہارت حاصل کریں اور کچھ اپنے آپ کو مذہبی علوم کے لیے وقف کریں، میں نہیں چاہتا کہ کافی سارے لوگ عوامی فنڈ پر گزارہ کریں۔

نوجوانوں کا یہ رجحان ایک صحت مندانہ فعل ہے، اس طرح یہ طالب علم زمانہ کے علوم اور جدید سائنسی علوم کے درمیان رابطے کا کام کریں گے اور اس سے بیش بہا

اسلامی فائدہ پہنچے گا۔

ان نظریات کو سمیٹنے پر جو میں نے اس اجتماع میں پیش کئے یہ خلاصہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

''یہ عظیم اور خود کفیل اسلامی کلچر ہے جس پر تحریک کا سارا دار و مدار ہے اور ہونا بھی چاہیے، یہ علمائے اسلام تہذیب اسلامی کے ماہرین اور زمانہ شناس ہیں جو قیادت کر سکتے ہیں اور جن کو کرنی چاہیے''

چند روز پیشتر میرے ایک دوست نے ایک کتاب دی جس میں ''درِ روشن'' کے عنوان سے ایک مقالہ تھا، یہ مقالہ ایک دوست نے لکھا جو سالہا سال یورپ میں رہا ہے، میں اس سے کبھی نہیں ملا ہوں لیکن اس کا عقیدت مند ہوں اس مقابلہ میں اس نے ''روایتی لیڈر شپ '' پر بحث کی ہے، اس مقالہ کے شروع میں اس نے ''حرکت '''' بنیاد'' اور حرکت کی بنیاد میں تبدیلی کو بیان کیا ہے کہ کس طرح حرکت ماہیت میں تغیر اور تحریک پیدا کرتی ہے اور نظاموں اور قالبوں کی صورت میں آتی ہے، اس نے ''متحرک'' کی ساکن میں تبدیلی پر بحث کی ہے اگر ہماری اجتماعی طاقتیں موج در موج اٹھیں اور جذب ہو جائیں تو یہ حرکت کی بنیاد میں تبدیلی کی وجہ ہے، ایسا اس لئے ہے کیوں کہ عمل اور فکر کو ایک شکل اور قالب دینے کی ضرورت ہے لہٰذا سب سے بنیادی کام یہ ہے کہ قالب، قالبوں کو ختم کر دینا چاہیے، پھر فرض کر لینا چاہیے کہ دینِ اسلام نوجوان کا دین ہے اور نوجوان قالبوں کو ختم کرتے ہیں، پس اسلام قالب شکنی کا دین ہے، اس کے بعد اس نے '' سنتی روایتی لیڈر شپ'' کے سوال پر بحث کی ہے جو اس وقت ہمارے زیر بحث ہے۔

میرا یہ نادیدہ دوست ہمیں اس بات کی اجازت دینے پر پس پشت نہیں کرے گا کہ اس کے بیان پر تنقید کی جائے، ہم بیان کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی نشان دہی کو خوش آمدید کہیں گے۔

پہلی بات جو ہمارے دوست نے سوچی ہے وہ یہ ہے کہ حرکت اور جنبش کے لیے ثبات کا انکار ضروری ہے لیکن اس نے یہ نہیں سوچا کہ اگر حرکت ثبات کے بغیر ہو تو اس کا نتیجہ ابتری اور بے نظمی ہے، نہ کہ ترقی و ارتقاء۔

قرآن جہاں ہدایت، حرکت اور کمال کی تعلیم دیتا ہے وہاں وہ صراط مستقیم کی تعلیم بھی دیتا ہے، انسان کو جب صراط مستقیم پر چلنا ہے تو یہ صراط مستقیم بذات خود کیا ہے؟ کیا صراط مستقیم ہدایت کرتا ہے؟ کیا یہ راستہ بھی متحرک ہے؟ کیا یہ صراط مستقیم محافظ ہے؟ اور ان کا نگران ہے جو کہ اس راستے کو اختیار کرتے ہیں؟ کیا یہ حرکت کو بنیاد میں تبدیل کرنے والا عامل ہے؟ کیا روایتی رہبروں کے لیے یہ گناہ ہے کہ وہ کلچر کے پاسدار ہیں، یعنی اس کلچر کے جو کمال اور حرکت کے ساتھ صراط مستقیم پر ہے، علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ''زندگی صرف تغیر اور سادہ نہیں ہے'' اس کے اندر بقاء و دوام کے عناصر موجود ہیں، وہ مزید کہتا ہے ''کہ اسلام خدا کے ساتھ وفاداری کا مطالبہ کرتا ہے، نہ کہ حکومت استبداد کی وفاداری کا'' اور خدا ہر زندگی کی آخری روحانی بنیاد ہے، لہٰذا خدا کے ساتھ وفاداری کا مطلب اپنی طبیعتِ مثالی کیساتھ وفاداری ہے، ایک سوسائٹی جو اس حقیقت پسندانہ نکتے پر یقین رکھتی ہو اسے چاہیے کہ وہ بذات خود اپنی زندگی میں ''ابدیت'' اور ''تغیر'' کی آپس میں سازگار پیدا کرے، اجتماعی حیات کی تنظیم کے لیے ابدی اصول اس کے پاس ہونے چاہئیں، اس دائمی متغیر دنیا میں جو چیز ابدی دائمی ہے وہ ہمارے لیے ایک مضبوط جگہ کھڑے ہونے کے لیے مہیا کرتی ہے۔

ہمارے دوست نے ''ساکن'' اور ''ثابت'' میں اشتباہ کیا ہے، اگر وہ اسلامی کلچر سے بخوبی واقف ہوتا تو وہ یہ جانتا کہ متغیر ہونا بغیر اثبات کے ناممکن ہیں، ہر چیز جو حرکت کرتی ہے یا کم از کم منزل اور مرحلہ میں تبدیلی واقع ہوتی ہے وہ ایک خاص معین مدار میں حرکت کرتی یا تبدیلی لاتی ہے وہ مدار بذات خود ثبات ہے، اس میں کوئی تبدیلی

حرکت نہیں وہ چیز جو تبدیلی ہوتی ہے یا کچھ عبور کرتی ہے وہ مرحلہ منزل ہے نہ کہ مدار اور راستہ ہے۔

اگر ہمارا دوست ہر چیز کے تاریخی وجود کا قائل ہے حتیٰ کہ اصول، حقائق، مکتب، آئیڈیالوجی اور کلچر کا تاریخی وجود ہوتا تو پھر ہزار اور چار سو سال پرانے اسلام جس کا وہ جان و دل سے دفاع کرتا ہے سے کیا چاہتا ہے؟

شاید یہ کہا جائے کہ اسلام بذات خود حرکت اور جنبش ہے، جو اپنے وجود کو دائمی زندگی بخشتا ہے نہ کہ بنیاد و نظام، ہمارا جواب یہ ہے کہ اسلام نہ تو حرکت ہے اور نہ متحرک نہ جنبش ہے اور نہ جنبش دینے والا، یعنی یہ اسلامی معاشرہ ہے جو اسلام کے مدار میں اور صراط مستقیم پر حرکت کر رہا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بعض دفعہ کوئی عظیم ہل چل مچا دینے والا واقعہ یا اجتماعی واقعہ اپنی اصل روح سے محروم ہو جاتا ہے اور آداب و رسوم و تکلفات کا ایک بے اثر سلسلہ باقی رہ جاتا ہے، حضرات امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا کہ:

امویوں کے ہاتھوں میں اسلام کی مثال اس طرح تھی جیسے کوئی شخص کسی برتن کو الٹا پکڑے ہوئے ہو اور برتن میں موجود تمام چیزیں نیچے گر رہی ہوں حتیٰ کہ برتن خالی ہو جائے اور صرف برتن اس کے ہاتھ میں رہے۔

یکفا الاسلام کما یکفا الانا (نہج البلاغہ خطبہ ۱۰۱)

یہ اجتماعی عمل حرکت کو بنیاد میں تبدیل کرنے کے مترادف ہے، ایک مثال سے میں اس کی مزید توضیح کرنا چاہتا ہوں۔

امام حسینؑ کی روایتی عزاداری حرکت کی بنیاد میں تبدیلی ہے، یہ عزاداری کہ جس کے متعلق کہا گیا ہے "من بکی او ابکی او تبا کی وجبت له الجنة" یہ بہت سی اہم باتیں اس میں پنہاں ہیں، عزاداری کا اصل فلسفہ یہ ہے کہ یزید، ابن زیاد اور اس کے

ساتھیوں سے اظہار بیزاری کیا جائے اور امام حسینؑ کی طرفداری اور حمایت کی جائے حسین علیہ السلام نے ایک وقت میں ایک مکتب کی صورت اختیار کی وہ ایک ہی وقت میں ایک اجتماع اور معین شدہ معاشرے کے طور واطور کی مثال اور دوسرے معین شدہ طور اطوار کی نفی کرنے والے بن گئے، حقیقت میں ایک آنسو کا قطرہ بہانا ذاتی قربانی کے مترادف ہے۔

سخت ترین یزیدی شرائط اور پابندیوں کی موجودگی میں حزب حسینی میں شمولیت اختیار کرنا شہداء پر برملا آنسو بہانا، سچوں کی حمایت کا یہ بانگِ دُہل اعلان کرنا اور اہل باطل کے خلاف اہل حق کے ساتھ مل کر جنگ کرنا، حقیقت میں ذاتی قربانی کی اقسام ہیں، یہ ظاہر کرتا ہے کہ حسین ابن علی علیہ السلام کی عزاداری حقیقت میں ایک حرکت، ایک موج اور ایک اجتماعی جنگ ہے۔

لیکن زمانے کے ساتھ ساتھ یہ فلسفہ اور یہ روح معدوم ہوتی گئی اور برتن خالی ہونا شروع ہو گیا حتیٰ کہ برتن کا تمام مواد ختم ہو گیا اور یہ صرف ایک ''عادت'' بن گئی کہ کچھ لوگ جمع ہو کر عزاداری کے مراسم میں مشغول رہتے ہیں، ان کے بحث ومباحثے کسی ایک اجتماعی سمت کا تعین نہیں کرتے، اجتماعی نقطہ نظر سے اس کو کوئی بامعنی اور نتیجہ خیز عمل قرار نہیں دیا جا سکتا ہے، یہ فقط ایک مذہبی فریضہ سمجھا جاتا ہے اور عزاداری مذہبی رسم کی حیثیت اختیار کر گئی ہے اور اس کا عہد حاضر کے حسینوں اور عہدِ حاضر کے یزیدیوں سے کوئی سروکار نہیں رہا، یہی وہ مقام ہے جہاں حرکت بنیاد یا عادت میں تبدیلی ہو گئی ہے اور یہ ہے برتن کا خالی ہو جانا، یہ اتنی رسمی صورت اختیار کر گئی ہے کہ یزید بن معاویہ قبر سے نکل آئے تو وہ نہ صرف خوشی سے اس رسم میں شریک ہو گا بلکہ ان رسوم کی ادائیگی کے لیے ایک بڑے گروہ کی تشکیل بھی کرے گا، ان اجتماعات میں لگاتار آنسو بہانے کا کیا فائدہ؟ یہ بات صحیح ہے اور میں نے کئی اجتماعات میں اس کے متعلق بیان کیا ہے لیکن ہمارے دوست سے سوال یہ ہے کہ آیا ہمارا پرانا کلچر جو کہ روایتی رہبری کی حفاظت میں ہے کیا چیز

ہے؟ کیا سید جمال، مدرس، آیت اللہ خمینی m اور طالقانی ان رسوم اور وضع داریوں کے محافظ ہیں؟ پھر ہم پوچھیں گے کہ رہنماؤں میں سے کونسا رہنما ہے جو عوام میں اتنا ہیجان اور حرکت پیدا کر سکے جتنا کہ روایتی لیڈر شپ پیدا کر سکتی ہے کیا کوئی غیر رسمی رہنما پچھلے دس سال کے دوران ان لوگوں میں دس فیصد حرکت بھی پیدا کر سکا ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہ اسلامی تحریک کی قیادت کو ''مذہبی علماء کے طبقے'' سے روشن خیال طبقے کی طرف منتقل کرنا چاہتے ہیں، وہ دلائل دیتے ہیں کہ ایرانی معاشرہ ایک مذہبی معاشرہ ہے اور اجتماعی عمر کے لحاظ سے پندرہویں اور سولہویں صدی کے یورپ کی مانند ہے، جہاں صرف مذہبی نعروں نے لوگوں میں حرکت پیدا کی، دوسری طرف ایرانی لوگ مسلم ہیں اور شیعہ عقیدہ رکھتے ہیں جو انقلابی اور حرکت پیدا کرنے والا مذہب ہے، آج کا ایران اجتماعی صورت میں پندرہویں اور سولہویں صدی کے یورپ کی مانند ہے، جہاں کی فضا میں صرف مذہبی سانس لی جا سکتی ہے اور صرف مذہبی نعروں کی بناء پر جوش اور ہیجان پیدا کیا گیا ہے، تیسری دلیل یہ ہے کہ ہر معاشرہ میں ایسے مخصوص روشن خیال افراد کا گروہ موجود رہتا ہے جو انسانی خود آ گاہ رکھتے ہیں اور موجودہ دور کے انسان کے مصائب و مسائل کا احساس رکھتے ہیں اور صرف اسی گروہ میں صلاحیت ہے کہ معاشرہ کی آزادی کا بوجھ اٹھا سکیں، ایران کے آج کے روشن خیال اگر موجودہ ایران اور موجودہ یورپ کا آپس میں موازنہ نہ کریں تو وہ غلطی پر ہوں گے اور یہ خبر سننے میں آئے گی کہ وہ ایران کے لیے وہی نسخہ تجویز کریں گے جو یورپ کے لیے رسل اور سارٹر تجویز کر رہے ہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ آج کا ایران پندرہویں اور سولہویں صدی کے یورپ کی سطح پر ہے نہ کہ بیسویں صدی کے یورپ کی سطح کا، دوسری بات یہ ہے کہ اسلام ''مسیحیت'' نہیں ہے، اسلام اور بالخصوص شیعی اسلام حرکت، انقلاب و خون، آزادی، جہاد اور شہادت کا مذہب ہے، ایران کے روشن خیال اس قریب نظر میں نہ آئیں کیونکہ آج کے یورپ میں

مذہب نہیں ہے اور وہاں مذہبی نقوش کو ختم کر دیا گیا ہے، لہٰذا ان کے نزدیک ایران میں بھی مذہبی نقوش کو ختم کر دینا چاہیے، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ نہ تو ایران یورپ ہے اور نہ اسلام مسیحیت ہے، ایران کے روشن خیال افراد کو چاہیے کہ وہ اس انقلاب کے عظیم منبع سے حرکت اور طاقت حاصل کر کے اپنے لوگوں کو آزادی کی کوشش کریں لیکن یہ یقینی ہے کہ اس کے ساتھ کچھ شرائط بھی ہیں، ان کے مطابق پہلی شرط یہ ہے کہ اس وقت مذہب کے جو محافظ اور نگہبان ہیں ان کی نمبرداری ختم کرنی چاہیے۔

ان روشن خیال افراد سے میری پہلی گزارش یہ ہوگی کہ ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام ایک حقیقت ہے نہ کہ ''مصلحت'' اور یہ ایک ''نصب العین'' ہے نہ کہ ''ایک وسیلہ'' لہٰذا صرف وہ افراد اسلام کی طاقت اور حرکت سے مستفیض ہو سکتے ہیں جو اس کو حقیقت اور ہدف سمجھتے ہیں نہ کہ وہ جو اس کو مصلحت اور وسیلہ خیال کرتے ہیں، اسلام ایک ایسا ''اوزار'' نہیں ہے جس سے ۱۶ صدی میں استفادہ کیا گیا ہے اور اب ۲۰ ویں صدی میں اس کے استعمال کی ضرورت نہیں رہی ہے، اسلام انسانیت کے لیے صراط مستقیم ہے، ایک متمدن انسان اتنا ہی اس کی رہنمائی کا محتاج ہے جتنا ایک غیر متمدن انسان یہ ترقی یافتہ انسان کو اتنی ہی آزادی اور نجات وسعادت عطا کرتا ہے، جتنا ابتدائی انسان! میں یہ ایک بہت بڑا المیہ ہوگا کہ ہم اسلام کو محض ایک وسیلہ اور ایک مصلحت کے طور پر جہاں بینی اور اجتماعی حالات کے لیے استعمال کریں، اس لیے ہم ان لوگوں سے اپیل کریں گے کہ وہ ان حالات کا ایک حقیقت پسندانہ جائزہ لیں اور اسلام کو اگر وہ حقیقت اور ہدف کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تو ہرگز مصلحت اور وسیلہ کی نگاہ سے بھی نہ دیکھیں۔

تاہم اگر اسلام ایک وسیلہ اور اوزار ہے تو پھر یہ حقیقی اسلام ہے نہ کہ وہ اسلام جس پر صرف اسلام کا خول چڑھایا گیا ہو۔ اگر ہر وسیلہ کے لیے ایسا ہی ہونا چاہیے کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ ایک نام نہاد روشن خیال جو فلاں پروفیسر کے ساتھ صبح کے ناشتے

میں شریک رہتا ہے کبھی اس نے ایسا علم حاصل کرنے کی کوشش کی ہے کہ حقیقی اور نقلی اسلام کی پہچان کی جا سکے؟ اور کبھی معاشرے کے مفاد میں اس علم کو استعمال کیا ہے؟

تیسری بات اگر مجھے معاف کیا جائے تو عرض کروں گا کہ یہ قابل احترام روشن خیال افراد کافی دیر کے بعد خواب سے بیدار ہوئے ہیں کیونکہ قدیم متولیوں نے حرکت و قوت کے اس سرچشمے کی نشاندہی کی ہے اور وہ اس سے استفادہ کرنے کے طریقوں سے واقف ہیں اور وہ اب نہیں چاہتے کہ ان کا ''خول'' اتر جائے۔

اسلام، اسلامی تہذیب اور اسلام کی طاقت اور صلاحیت کو اسلام کے ان متولیوں کے لیے چھوڑ دینا چاہیے جو اسلام کی نگہداشت کرتے ہیں اور جو اسلام کے ماحول میں پروان چڑھے ہیں اور جن کے اوزاروں سے عام لوگ مانوس ہیں۔ رسالہ ''اقبال معمار تجدید بنائے اسلام'' میں سید جمال کی سرگرمیوں اور انہوں نے اسلامی دنیا میں جو ہیجان اور انقلابی کیفیت برپا کر دی, کے بارے میں تجزیہ کرتے ہوئے درج ہے کہ:

''اس نے اتنی طاقت اور اثر کیسے حاصل کیا؟ وہ کیا اسباب تھے جو اس بات کے موجب بنے کہ تن تنہا ایک شخص کی آواز مملکتوں کی حدود کو توڑ کر لوگوں کے دلوں میں اترتی رہی، کیا یہ اس سبب کے علاوہ کوئی اور سبب تھا کہ مسلمان اس آواز کو اپنے کسی شناسا کی آواز محسوس کرتے تھے، ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ آواز اپنی درخشاں تاریخ، تہذیب کے ضمیر کی گہرائیوں اور اعلیٰ افتخار سے ابھری تھی، انہوں نے دیکھا کہ یہ آواز کوئی اجنبی آواز نہیں تھی اور نہ ہی باہر کے خیالات کی عکاسی کرنے والی آواز تھی، یہ انہی آوازوں کی گونج تھی جو کبھی حرا، مکہ، مدینہ، احد، قادسیہ، بیت المقدس، جبل الطارق، اور صلیبی جنگوں کے دوران ابھری تھیں، یہ وہی صدا تھی جو عزت و وقار کے لیے جہاد کرنے کے لیے بلند کی گئی اور تاریخ اسلام میں یہ صدا بار بار گوش گزار ہوتی رہی، یہ جو کچھ سید کے بارے میں کہا گیا ہے بالکل ٹھیک اور حقائق پر مبنی ہے، اس کی صدا تہذیبی روح کی گہرائیوں

سے اور اسلام کی پر افتخار تاریخ سے نکلی تھی، یہ اس لیے کہ سید بذات خود اسی تہذیب کی پیداوار تھا اور اس کی روح نے اسی تہذیب میں نشو ونما پائی تھی۔

ایران کی اسلامی بیداری کی تحریکوں کے لیے یہ باعث افتخار ہے کہ ان کی قیادت ان بہادر، نڈر اور صاحب علم افراد کے ہاتھ میں ہے جو موجودہ دور کی ضروریات و احتیاجات سے کما حقہ آگاہ ہیں، عوام کے ہمدرد اور اسلام کی سربلندی کے لیے سرگرمِ عمل ہیں، ناامیدی اور مایوسی جو کہ شیطان کی افواج ہیں ان کے اندر نہیں پائی جاتیں۔

اسمیں کوئی شک نہیں کہ موجودہ مراجع کے مقابلہ میں ماضی میں کئی ایسے مراجع گزرے ہیں جن کی مرجعیت کی شان بہت اعلیٰ اور ان کے مقلدین کی تعداد بہت زیادہ رہی ہے لیکن اس کے مقابلے میں ان کی شہرت اور اثر کم تھا اور غیر متزلزل طور پر مذہبی کاموں کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنا موجودہ قیادت کی امتیازی صفت ہے۔

ہم اس بے لوث عظیم الشان قیادت کو زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور ہمارے لیے یہ بات باعث فخر ہو گی کہ ان شاندار خدمات کو تاریخ کے صفحوں میں محفوظ کرلیں اور خداوند عزوجل کے سامنے دست بہ دعا ہوں کہ ان کی کامیابیوں میں اضافہ کر۔

مراجع عظام جن میں آیۃ اللہ العظمیٰ شریعتمداری، آیۃ العظمیٰ گلپائیگانی، آیۃ اللہ العظمیٰ مرعشی نجفی جنہوں نے کلمہ حق کی آواز بلند کی اور اسلام و مسلمین کی سربلندی اور فخر کا باعث بنے ہیں ان کے اسمائے گرامی تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ درخشاں رہیں گے، یہ صرف وہ کمترین اجر ہے جو خداوند تعالیٰ نے ان کو عطا کیا ہے لیکن مجھے ان کے متعلق کہنے دیجئے جو کہ "پردیسی " ہے اور ہمارے دلوں کی دھڑکنیں اس کیساتھ ساتھ ہیں اس کا نام، اس کی یاد، اس کے کلمات، اس کی پرجوش روح، اس کا پختہ ارادہ وعزم، اس کی استقامت، اس کی شجاعت، اس کی رجائیت اور اس کا ایمانی جذبہ ہر خاص و عام کی زبان

پر ہے یعنی میرا مقصد فرزندان ایران میں سب سے پیارا اور سب سے اعلیٰ، آنکھوں کی ٹھنڈک اور ملت ایران کا عزیز ترین استاد عالیٰ قدر اور ہمارے بزرگ حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خمینی m وہ ایسا حسین تحفہ ہے جو خداوند تعالیٰ نے ہمیں عطاء فرمایا ہے اور وہ ان واضح کلمات کے مصداق ہیں:

ان اللہ فی کل خلف عدوہ ینفون عنہ تحریف المبطلین

میری قلم بے تاب ہے کہ اس استادِ بزرگ کے بارے میں کہ جس کی صحبت اور شاگردی میں، میں نے بارہ سال گزارے، کچھ لکھوں، میں نے ان سے بے پناہ روحانی، اور معنوی فیض حاصل کیا ہے۔

ظاہراً اس اسلامی بیداری کی تحریک میں روحانی اور غیر روحانی شخصیات کی بھاری تعداد نے حصہ لیا، ایسے لوگ اور گروپ بھی ہیں جو اس تحریک کی فکری اور عملی فعالیت سے کئی سال پہلے اس میں کام کر رہے تھے، بلاشبہ انہوں نے جدید نسل کے ذہنوں میں ایسے خیالات اور نقش بنائے ہیں جو اس عظیم تحریک کے لیے ممدو معاون ثابت ہوئے، کچھ دوسرے لوگوں نے تحریک کو آخری مرحلے تک پہنچانے میں تعاون کیا اور اس کو وسعت دینے اور اس کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لیے بہت زیادہ قربانیاں دیں، حتیٰ کہ ان کو جیلوں میں ڈالا گیا، ان کو نیست و نابود کیا گیا، جن کے نام تاریخ میں درخشندہ طور پر محفوظ کر لیے گئے ہیں وہ تحریک میں وسعت پیدا کر کے اس کو بلندیوں پر لے گئے اور اس کو ایک خاص سمت میں ڈال دیا تاہم کچھ ایسے بھی ہیں جو آدھے راستے میں ہی تھک گئے اور ان کے اعصاب جواب دے گئے اورنہوں نے اپنے قدم روک لئے جبکہ کچھ نے اپنے آپ کو بدل لیا، کچھ نے اپنے راستے کو بدل کر دوسرے نظریات کو جذب کر کیاپنے ذہنوں میں ناسور پیدا کر لئے، اگر اس تحریک کی تحلیلی اور عملی تاریخ تعصّبات اور توہمات سے بالا ہو کر لکھی جائے تو یہ ایک ضخیم کتاب بنے گی، اس چھوٹی سی کتاب میں

ہم اس موضوع پر زیادہ لکھ سکتے اوران تمام مطالب کی وضاحت نہیں کر سکتے، ہم صرف یہاں خداوندتعالیٰ سے دست بدعا ہیں کہ وہ تمام لوگوں کوخیر وبرکت دے جو سچے دل اور نیک نیت کے ساتھ اس تحریک کے مقاصد کے حصول کی خاطر سرگرم ہیں۔[1]

بحران

دوسرے کئی واقعات کی طرح تحریکیں بھی بحرانوں کا شکار ہوتی رہتی ہیں لیکن یہ قیادت کا فرض ہے کہ وہ تحریک کو بحران سے بچائے، اگر بحران آ بھی جائے تو قیادت اعتماد بحال کر کے اپنی تحویل میں موجود تمام ذرائع سے استفادہ کرتے ہوئے بحران سے تحریک کو بچانے کی بھرپور کوشش کرتی ہے، بحران کو سمجھنے میں سستی کرنے یا اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکنے کی وجہ سے یا تو تحریکیں منزل مقصود تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہوجاتی ہیں یا ان کا رخ کسی اورطرف موڑ دیا جاتا ہے ہم چاہتے ہیں کہ اس تحریک کے کچھ ممکنہ خطرات کا جائزہ لیں، ممکن ہے کہ کچھ خطرات ہماری نظروں سے بھی اوجھل رہ جائیں۔

ا۔غیر ملکی نظریات کا دخل

باہر کے نظریات دوطرح سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔

1۔منزل پر پہنچ جاتی ہے جہاں اس میں پوری قوم کوحرکت میں لانے کی اہلیت پیدا ہو جاتی ہے اورتحریک تیزی سے مقبول ہونے لگتی ہے تو اسوقت تحریک تمام دوسرے نظریات پر چھا جاتی ہے اور دوسرے نظریات کے حامی لوگ اس کو ناکام کرنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں، وہ بیرونی نظریات تحریک کے اثر کوکم یا زائل

[1] یہ تحریک اسلامی ایران کے برپا ہونے سے پہلے کی ہے،شہید مرتضیٰ مطہری کی یہ الٰہی آرزو ان کی زندگی میں ہی برآئی اور ۱۹۷۹ کو انقلاب اسلامی امام خمینی m کی قیادت میں کامیابی سے ہمکنار ہوا

کرنے میں ایک کردار ادا کرتے ہیں۔

اسلام کے پہلے ادوار میں کچھ ایسا ہی ہوا، جب اسلام دنیا کے نقشے پر وسیع سے وسیع تر ہونے لگا تو اسلام دشمنوں نے اسلام کو مسخ کرنے کے لئے تحریفی جہاد کیا اور اسلام کے لیبل میں اپنے نظریات کو پھیلانے کی کوشش کی، جیسے یہودی، مجوسی، مانوی افکار اسلام کے نام پر حدیث، تفسیر اور مسلمانوں کے افکار میں داخل ہو گئے، انہوں نے جس طریقہ سے اسلامی اقدار کو مسخ کرنے کی کوشش کی وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے لیکن ان صاحبانِ علم کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جنہوں نے اس کی بروقت تشخیص کر کے اس کا مداوا کیا اور ان کے اثر کو زائل کرنے میں کامیاب ہوئے اور ان حضرات کی کوششیں آج بھی جاری ہیں۔

2۔اسلام کے خلاف دوسرا طریقہ خود اسلام کے پیرووٴں کے ہاتھوں استعمال ہوا، بعض دفعہ پیروکار مکتب فکر کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے دوسرے متوازی نظریات سے شعوری اور غیر شعوری طور پر متاثر ہو جاتے ہیں اور دوسرے نظریات کو اپنے مکتب کے رنگ میں پیش کرتے ہیں اس طرح کے حالات اسلام کے اولین ادوار میں پیش آئے، مثلاً کچھ لوگوں نے اسلام کی خدمت کے خیال سے یونانی فلسفہ، ایرانی رسومات و آداب اور ہندوستانی تصوف کو اسلامی تعلیمات میں شامل کرنے کی کوشش کی، خوش قسمتی سے صاحبانِ دانش کی عمیق نظروں نے ان باتوں کو فوراً بھانپ کر ان کا تدراک کیا، انہوں نے ان کا تنقیدی جائزہ لے کر درآمد شدہ نظریات کی

بیخ کنی کی۔

آج جب کہ ایران میں اسلامی تحریک اپنے عروج پر پہنچ چکی ہے اور دوسرے تمام مکاتبِ فکر پر چھا چکی ہے تو ایسے حالات پیدا کئے جا سکتے ہیں جو اس تحریک کے رخ کو موڑنے یا اس کو ختم کرنے پر منتج ہوں، ایک گروہ ایسا ہے جو مادیت پرستی کا واضح رجحان رکھتا ہے لیکن ان کو احساس ہے کہ ان کے نعروں میں اتنی جاذبیت نہیں ہے کہ وہ ایرانی نوجوانوں کو متاثر کر سکیں، لہٰذا انہوں نے اپنے نعرہ کو اسلامی رنگ دینے کی کوشش کی ہے، یہ قدرتی امر ہے کہ اسلام جن نوجوان اذہان میں آیا ان میں مادیت کا اثر پہلے سے موجود تھا اور وہ مادیت کے لپیٹ میں تھے، یہاں اسلام سطحی طور پر آیا اور ایسے افراد جو بنیادی طور پر آگاہ نہیں ہوتے اور بیرونی نظریات پر فریفتہ ہوتے ہیں، وہ اخلاقیات پر لکھنا اور بولنا شروع کر دیتے ہیں حالانکہ وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ وہ دراصل بیرونی نظریہ کی اخلاقیات کا پرچار کر رہے ہیں، یہ اپنے آپ کو صرف اخلاقیات تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ دوسرے علوم مثلاً تاریخ، فلسفہ، مذہب، پیغمبری کا تصور، اقتصادیات، سیاسیات، بین الاقوامیت اور تفسیر وغیرہ کے متعلق بھی بولنا اور لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

بحیثیت ذمہ دار شخص کے اور ان ذمہ داریوں کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر ڈالی ہیں میں یہ اپنا فرض اولین سمجھتا ہوں کہ اسلامی تحریک کے ان بڑے بڑے لیڈروں کو کہ جن کی میرے ذہن میں بہت قدر و منزلت ہے، آگاہ کر دوں کہ وہ بیرونی

نظریات پر اسلامی فکر کی مہر ثبت کر کے ارادی یا غیر ارادی طور پر اس کا پرچار کر رہے ہیں اور یہ بات اسلام کی بنیادوں کے لئے بہت ہی خطرناک ہے، ہم ذمہ دار اشخاص ہیں اور ہم نے دورِ جدید کی زبان میں اسلام کے کئی پہلوؤں پر زیادہ لٹریچر شائع نہیں کیا ہے، یہ یقینی بہت ہے کہ اگر ہم نے پاک اور صاف پانی زیادہ مقدار میں جمع کیا ہوتا، تو لوگ گندے پانی سے اپنے آپ کو سیراب نہ کرتے، اس کا حل یہ ہے کہ ہم اسلامی مکتب فکر کے نظریات کو آج کی زبان میں متعارف کرائیں، ہمارے تعلیمی مراکز خاص طور پر جاگ چکے ہیں لیکن انہیں ان عظیم تعلیمی فکری ذمہ داریوں سے آگاہ ہونا چاہیے جو ان کے کندھوں پر ڈالی گئی ہیں، انہیں اپنی مصروفیات کو تیز سے تیز تر کرنا چاہیے، وہ صرف فقہ اور بنیادی امور تک اپنے آپ کو محدود نہ رکھیں کیوں کہ ایسا کرنے سے وہ دورِ جدید کے نوجوانوں کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکیں گے۔

۲۔ انتہائی قدامت پسندی

کسی بھی کام میں انتہا پسندی سے پرہیز اور میانہ روی اختیار کرنے سے کچھ مسائل سے دو چار ہونا پڑتا ہے، میانہ روی کا راستہ نہایت ہی تنگ اور پر خطر ہوتا ہے، ذرا سی بے احتیاطی راستہ سے دور لے جانے کی موجب بن سکتی ہے، مذہب میں ''صراط مستقیم'' کو ''بال'' سے زیادہ باریک قرار دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس راستے پر ہر قدم سوچ سمجھ کر رکھنا چاہیے۔

یہ ظاہر ہے کہ انسانی سوسائٹی کے سامنے نت نئے مسائل ہیں اور ان کے حل کے لیے نئے طریقے اپنانے کی ضرورت ہے، عصر حاضر کے مسائل اور روز بروز کے

پیچیدہ واقعات کا حل تلاش کرنا اسلامی تعلیمات کا دفاع کرنے والوں کا فرض ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک مجتہد اور مرجع کا وجود ہر دور میں ضروری ہے، اس لیے زندہ مجتہد کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے، اگر تمام مسائل ایک ہی نوعیت کے ہوں تو پھر زندہ اور فوت شدہ مجتہد کی تقلید میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

زندہ مجتہد جب دورِ حاضر کے مسائل پر توجہ نہ دے رہے ہوں تو وہ مردوں یا فوت شدگان کے زمرہ میں آ جاتے ہیں، قدامت پسندوں کا مسئلہ یہاں سمجھایا جا سکتا ہے، کچھ دوسرے ''عوام زدہ'' ہیں وہ عوام الناس کی حکمرانی سے متاثر ہیں اور ان کا معیار صرف عوام الناس کے مزاج پر منحصر ہوتا ہے، عوام الناس عموماً پیچھے کی طرف دیکھتے ہیں اور مستقبل پر نظر رکھتے ہیں لیکن بدقسمتی سے وہ اسلام پر سختی سے کاربند نہیں ہیں، ان کے لیے معیار صرف یہ ہے کہ حالات کا رخ کس طرف ہے اور اس کو ''آزاد جہاد'' کا نام دیتے ہیں۔

بجائے اس کہ وہ سچ اور جھوٹ کی پہچان اسلام کی کسوٹی پر کریں، وہ حالات کے رخ پر بہتے ہیں اور اقتدار اعلیٰ کے موڈ اور قوت کو اسلام کا معیار قرار دیتے ہیں، مثلاً ایک سے زیادہ شادی کو عورتوں کے دورِ غلامی کی نشانی قرار دیتے ہیں اور یہی کچھ پردہ کے متعلق کہتے ہیں۔

وہ دلیل دیتے ہیں کہ مزارعیت، شراکت اور جاگیرداری، جاگیردارانہ نظام کے اثرات ہیں اور اس طرح بہت سے احکام کو وہ زمانہ رفتہ کی باقیات سمجھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اسلام دین، عقل اور اجتہاد ہے اور اجتہاد اسی کا متقاضی ہے۔

یہ ذہن نشین رہنا چاہیے کہ وہ معیار جو اہل تسنن کے روشن فکروں مثلاً عبدہ، اور اقبال نے مختلف مسائل کے بارے میں بیان کئے ہیں، جیسے عبادات اور معاملات کے فرق کے بارے میں اور انہوں نے اجماع، اجتہاد اور شوریٰ وغیرہ کی مخصوص تشریحات کی ہیں، ان کے تصورات ہمارے لیے اس طور پر کہ ہم شیعہ عقائد کی ترقی پسندانہ اسلامی

ثقافت کے ماحول میں پروان چڑھے ہیں، کبھی قابلِ قبول نہیں ہیں، شیعہ فقہ، شیعہ حدیث، شیعہ کلام، شیعہ فلسفہ، شیعہ تفسیر، شیعہ فلسفۂ اجتماع ایسے سنی علوم کے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ واضح ہے۔

یہ سچ ہوسکتا ہے کہ جغرافیائی اور غیر جغرافیائی بنیادوں پر سنی دنیا شیعہ دنیا کی نسبت دورِ حاضر کی تہذیب اور اس کی مشکلات کے بارے میں زیادہ علم رکھتی ہو اور انہوں نے ان مشکلات کو حل کرنے کے لیے مستعدی سے کوشش بھی کی ہو، اس کے مقابلہ میں شیعوں نے ان مشکلات کے حل کے لیے زیادہ مستعدی نہیں دکھائی لیکن پچھلے چند سالوں میں سنیوں اور شیعوں نے اس میدان میں جو کام کئے ہیں ان کے تقابل سے یہ معلوم ہوتا ہے، اہل بیت علیہم السلام کے مکتب کی پیروی کی برکت سے شیعوں کے پیش کردہ نظریات زیادہ گہرے اور زیادہ منطقی ہیں، ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ہم عبدہ، اقبال، فرید وجدی، سید قطب، محمد قطب اور محمد غزالی جیسے حضرات کو اپنا ماڈل بنائیں۔

بہر حال غیر متعدل جدت پسندی کا شکار شیعہ اور سنی دونوں ہیں، اس طرح کی جدت پسندی کا مقصد یہ ہے کہ اسلام میں سے اسلامی عناصر نکال پھینکے جائیں اور غیر اسلامی عناصر داخل کر دیئے جائیں اور یہ سب اس لیے کیا جاتا ہے کہ اسلام کو نئے زمانے کے سانچے میں ڈھالا جائے اور موجودہ زمانے کی نفسیات کے مطابق بنایا جائے، یہ تحریک کے لیے نقصان دہ ہے اور تحریک کے اربابِ حل وعقد کا فرض ہے کہ وہ اس کی روک تھام کریں۔

۳۔ نامکمل چھوڑنا

پچھلے ایک سو سال کی اسلامی بیداری کی تحریکوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ ایک بدقسمتی نظر آئے گی کہ ان تحریکوں کی مذہبی قیادت میں ایک بنیادی کمزوری رہی ہے کہ

انہوں نے دشمن پر مکمل کامیابی حاصل کرنے تک کوشش کی لیکن آخر میں آ کر اپنی سرگرمیوں کو روک دیا اور اپنی ریاضت کا پھل دوسروں کے حوالے کر دیا اور غالباً دشمنوں کے ہاتھوں میں اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی اپنی غصب شدہ زمین حاصل کر لینے کے بعد گھر میں آرام سے بیٹھ جائے اور دوسرے اس کی زمین کو آباد کر کے بیج بوئیں اور فصل کھائیں عراقی انقلاب شیعہ علمائے دین کی قیادت میں ابھرا لیکن شیعہ مکتبِ فکر نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا اور اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔

ایران کی آئینی تحریک بھی شیعہ علماء کے زیرِ اثر تھی لیکن نا مکمل چھوڑ دی گئی اور اس سے صحیح نتائج بھی حاصل نہ کئے جا سکے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایسا ڈکٹیٹر پیدا ہوا جس نے آئین کی حکمرانی کو صرف نام کی حد تک باقی رکھا، صرف یہ نہیں بلکہ لوگوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ ڈکٹیٹر شپ آئینی حکومت سے زیادہ فائدہ مند ہے اور آئینی حکومت ایک گناہ ہے، یہ بھی بڑے افسوس کی بات ہے کہ تمبا کو کی تحریک بھی اس وقت نامکمل چھوڑ دی گئی جب معاہدہ کی منسوخی کا اعلان کیا گیا حالانکہ یہ تحریک لوگوں کو صحیح اسلامی حکومت بنانے کے لیے متحد اور منظم کر سکتی تھی۔

ایران میں موجودہ اسلامی تحریک ایک نظام سے انکار کی منزل پر ہے، لوگ متحد چٹان کی طرح استبدادیت اور نو آبادیت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، انکار کی منزل کے بعد ہمیشہ اثبات اور تعمیر کی منزل آیا کرتی ہے۔''لا الہ کے بعد الا اللّٰہ'' کی منزل ہے کسی تحریک میں انکار و اثبات کی منزل کے بعد اثبات اور تعمیر کی منزل زیادہ کٹھن اور دشوار ہوتی ہے، آج پھر دانشوروں کے ذہن میں یہ بات ایک سوال بن کر ابھر رہی ہے کہ سابقہ تحریکوں کی طرح اس مرتبہ بھی علماء تحریک کو ادھورا چھوڑ دیں گے؟

۴۔موقع پرستوں کی رخنہ اندازیاں

کسی تحریک میں شامل موقع پرستوں کی رخنہ اندازیاں اوراثر ورسوخ سے اس تحریک کو بڑا خطرہ لاحق ہوتا ہے، یہ صحیح رہنما کا فرض ہوتا ہے کہ وہ ان کے اثرات کو زائل اوران کی کوششوں کو ناکام بنائیں، کوئی تحریک جب ابتدائی دشوار منازل کو طے کر لیتی ہے تو اس تحریک کے باایثار، صاحب ایمان اور مخلص کارکنوں پر بھاری ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے کیونکہ اس منزل کے پانے کے فوراً بعد موقع پرست ان کے گرد اپنا حلقہ بنا لیتے ہیں، دشواریاں اور مشکلات جتنی کم ہوتی جائیں گی اتنے ہی زیادہ موقع پرست تحریک کے ساتھ اپنی وابستگی ظاہر کریں گے، وہ موقع پرست کوشش کرتے رہتے ہیں کہ سچے اور باایثار انقلابیوں کو بتدریج راستے سے ہٹاتے جائیں، یہ عمل اتنا زیادہ ہمہ گیر ہو چکا ہے کہ اب کہا جاتا ہے کہ ''انقلاب خود اپنے بچوں کو کھا جاتا ہے'' لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ انقلاب خود نہیں ہوتا جو اپنے بچوں کو نگل جاتا ہے بلکہ یہ موقع پرستوں کی رخنہ اندازی اور ریشہ دوانی سے غفلت برتنے کا نتیجہ ہے۔

زیادہ دور مت جایئے! یہاں ایران میں وہ کون لوگ تھے جو آئینی انقلاب لائے اور وہ کون تھے جنہوں نے انقلاب کی کامیابی پر اعلیٰ عہدے سنبھالے؟ اوراس کا آخری نتیجہ کیا نکلا؟

قوم پرست رہنما اور قومی سورما اور آزادی کے تمام متوالے راستے سے ہٹا کر بھلا دیئے گئے اور انہوں نے بھوک اور گمنامی کی حالت میں دم توڑ دیا لیکن اس کے مقابلہ میں وہ ''سورما'' جو آخری وقت تک انقلابیوں کے خلاف آمریت کے جھنڈے تلے لڑتے رہے، وزیر اعظم کے عہدہ پر پہنچے، نتیجہ یہ نکلا کہ آئینی حکومت کے بھیس میں مطلق العنانی وجود میں آئی۔

موقع پرستوں نے اپنے ہتھیار اسلام کے پہلے دور میں بھی استعمال کئے، خلیفہ عثمان کے زمانے میں وزارت اور مشاورت کے اہم عہدوں پر وہ لوگ فائز ہو گئے جو اس قابل نہیں تھے اور جو لوگ ان عہدوں کے اہل تھے ان کو ملک بدر کر دیا گیا یا ان کے حلقہ اثر کو محدود کر دیا گیا، مثلاً ابوذر غفاری اور عمار یاسر۔

قرآن نے فتح مکہ [1] سے قبل کے انفاق اور جہاد اور فتح کے بعد کے انفاق اور جہاد کا تذکرہ کر کے درحقیقت فتح مکہ سے پہلے اور فتح مکہ کے بعد کے مومنوں، مجاہدوں اور اہل نفاق کے فرق کو واضح کیا ہے جنہوں نے فتح سے پہلے قربانیاں پیش کیں، وہ ان کی طرح نہیں ہیں جنہوں نے فتح کے بعد ایسا کیا، پہلے والے دوسروں کی نسبت اعلیٰ اوصاف کے مالک ہیں، معنی صاف اور واضح ہیں کہ فتح سے پہلے صرف مصیبت و مشقت کے کڑوے گھونٹ تھے، لڑنے والوں کا یقین پختہ تھا اور ان کی قربانیاں بے لوث اور سچی تھیں وہ موقع پرستی اور ذاتی مفاد سے کوسوں دور تھے لیکن فتح کے بعد قربانیاں اور کوششیں کسی ذاتی مقصد کے بغیر نہیں تھیں، پہلے مجاہدین کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ "آپ کے ۲۰ نفر کافروں کے ۱۰۰ نفر کے برابر ہیں" لیکن اگر ان میں یقینِ کامل پیدا نہ ہوا ہو، اسلامی روح ان کے اندر پوری طرح نہ سمائی ہوئی ہو اور وہ اسلامی تحریک پر پختہ یقین نہ رکھتے ہوں تو اسلام وہاں صرف موقع پرستی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور پھر ان کے ایک سو آدمی دشمن کے ۲۰ آدمیوں کے برابر ہوتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ موقع پرستوں کے خلاف جہاد کرنا تحریک کو صحیح راستے پر چلانے کے لیے اشد ضروری ہے۔

---

[1] سورہ حدید ۱۰

مستقبل کی مبہم وغیر واضح منصوبہ بندی

فرض کریں کہ ہم ایک ایسے بے تکے اور بوسیدہ مکان کو ختم کرنا چاہتے ہیں جس میں ہم انتہائی مشکل حالات میں رہ رہے ہیں اور اس کی جگہ ایسا مکان بنانا چاہتے ہیں جس میں سابقہ مکان کے نقائص موجود نہ ہوں، ہماری راحت و آرام کے ساز و سامان سے پوری طرح لیس ہو، اس صورت میں دو چیزیں ہمارے دماغ میں آئیں گی، ایک منفی احساس کے ضمن میں ہم پر آشکارا ہے، کہ ہمیں کیا کرنا ہے، ظاہر اس بات کی تشریح کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ہم اس فرسودہ مکان کو کیوں گرانا چاہتے ہیں لیکن اس مثبت احساس کے حوالے سے اگر نئے مکان کے بارے میں ہمیں مفصلاً بتا دیا جائے کہ اس میں کیا کیا سہولتیں ہوں گی تو اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی کہ اس کو قبول کر لینے کے اعلان میں کوئی رکاوٹ محسوس نہ کریں لیکن جب ایک صورت میں کہ نئے مکان کا کوئی پلان ہمارے سامنے نہ رکھا جائے اور صرف یہ کہا جائے کہ اس بوسیدہ مکان کو گرانے کے بعد ایک عالی شان مکان تعمیر کیا جائے گا تو یہ ہمارا تجسس کو بڑھائے گا اور ساتھ ہی تشویش کا عنصر بھی نمایاں ہوگا۔

اسے ایک مثال سے سمجھایا جا سکتا ہے کہ فرض کریں انجینئروں کے دو گروپ تعمیرات کے دو مختلف پلان دیتے ہیں، ایک گروپ نے نہایت محتاط طریقہ سے پلان بنایا اور اس کی تمام تفصیلات اور اندرونی ڈھانچہ کی وضاحت کی ہے اور اس کے مقابلے میں دوسرے گروپ نے جو تعمیرات میں کافی مہارت رکھنے کی وجہ سے لوگوں کا اعتماد رکھتا ہے اپنے پلان کی تفصیلات سے آگاہ نہیں کیا ہے صرف زبانی طور پر یقین دلایا ہے کہ اس کی بنائی ہوئی بلڈنگ اعلیٰ درجہ کی ہوگی تو یہ ممکن ہے کہ اس گروپ کے مبہم وغیر واضح اعلان کی وجہ سے ہم دوسرے گروپ کی طرف مائل ہو جائیں۔

ہمارے مذہبی علماء انجینئروں کے اس گروپ جیسے ہیں جن کو لوگوں کا اعتماد تو حاصل ہے لیکن انہوں نے مستقبل کے کسی واضح پلان کے بارے میں عوام کو آگاہ نہیں کیا اور نہ ہی کوئی ایسا پلان پیش کیا ہے جس کو منظور کرایا جاسکے جب کہ دوسری جماعتوں کے پاس منصوبے اور نقشے موجود ہیں جو واضح ہیں اور بخوبی معلوم ہے کہ حکومت، قانون، آزادی، سرمایہ، ملکیت، عدالت اور اخلاقیات کے لحاظ سے وہ کس طرح کے معاشرے کو قائم کرنا چاہتے ہیں۔

یہ تجربہ سے ثابت ہے کہ مستقبل کے واضح لائحہ عمل کا نہ ہونا انسان کے لیے کافی نقصان دہ ہے، کسی تحریک کے لیے بہت ضروری ہے کہ اس کے مستقبل کے پلان سے متعلق اس کے لیڈروں کے درمیان مکمل رضا مندی اور اتفاق ہوتا کہ ممکنہ نقصانات سے بچا جاسکے، ہم اللہ تعالیٰ کا شکرادا کرتے ہیں کہ ثقافت کے خام مال کے لحاظ سے ہم کسی کے محتاط نہیں ہیں اور ہمیں کسی سرچشمے کی ضرورت نہیں، صرف جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اپنے مقصد کے لیے ثقافتی مال کو باہر نکال کر صاف کیا جائے اور اس کو کارآمد بنایا جائے، اس کے لیے ہوشیاری، محنت اور وقت کے صحیح استعمال کی ضرورت ہے۔

یہ چیز باعث اطمینان ہے کہ ہوشیاری اور بیداری کا ہمارا حوزہ ہائے علمیہ میں آغاز ہو چکا ہے اور خدا سے امید ہے کہ اس میں مزید اضافہ ہوتا رہے گا اور ہماری آرزو جلد پوری ہوجائے گی۔

اللھم حق رجائنا ولا تخیب امالنا

۶۔ چھٹا اندیشہ

جو الٰہی تحریک کے لیے خطرناک بن سکتا ہے وہ اس کے امور کے متعلق ہے:

ایک اندیشہ جو الٰہی تحریک کے لیے خطرہ بنتا ہے وہ افکار کی سمت میں تغیر اور

ارادوں میں تبدیلی ہے، الٰہی تحریک اللہ کے لیے چلائی جاتی ہے اور اس کو اللہ کے لیے چلتے رہنا چاہیے، آخری کامیابی تک اللہ کے سوا کسی قسم کا خیال تحریک میں داخل نہیں ہونا چاہیے، تبدیلی کا ارادہ تک نہیں کرنا چاہیے اگر ان میں ذرا بھی کمزوری ہوگی تو اندیشے اور خطرات اس کے راستے میں آجائیں گے اور اس کو تباہ کردیں گے جو تحریک کا آغاز کرتا ہے وہ خوشنودئ خدا کے علاوہ اور کچھ سوچ بھی نہیں سکتا، وہ اللہ کی ذات مقدس پر توکل رکھتا ہے اور ذہنی طور پر خود کو ہر وقت اللہ کے حضور میں حاضر سمجھتا ہے، قرآن میں شعیب نبیؑ کی زبانی ارشاد ہوتا ہے:

اِنۡ اُرِيۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ‌ؕ وَمَا
تَوۡفِيۡقِىۡۤ اِلَّا بِاللّٰهِ‌ؕ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَاِلَيۡهِ اُنِيۡبُ ۝۸۸

(سورۃ ہود ۸۸)

مسلمانوں کا ایک گروہ جنگ لڑنے کے بعد مدینہ واپس لوٹا، تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا:

مرحبہ بقوم قضوا الجہاد الاصغر وبقی علیھم الجہاد الاکبر

آفرین ہے ان لوگوں پر جنہوں نے جہادِ اصغر کو مکمل کرلیا، لیکن جہادِ اکبر باقی ہے۔[1]

وہ بولے، یا رسول اللہ وما الجہاد الاکبر، جہاد اکبر کیا ہے، فرمایا: خواہش نفس کے خلاف جہاد۔

انکار کی منزل پر جب ساری سرگرمیاں بیرونی دشمنوں سے برسرِ پیکار رہنے میں صرف ہورہی ہوتی ہیں تو خیال اور نیت کو پاک وآلائش سے الجھنا قدرے آسان ہوتے ہے لیکن جب تحریک عروج پر پہنچ جائے اور تعمیر کی مثبت منزل آجائے اور موقع پرستوں کو

---

[1] معانی الاخبار، باب معنی الجہاد الاکبر

بھی کافی مواقع میسر ہوں تو اس منزل پر اتحاد و یگانگت اور خلوص کو قائم رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

سورۃ مائدہ قرآن کی ان آخری سورتوں میں سے ایک ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے آخری دو تین مہینوں میں نازل ہوئی، اس وقت مشرکین کی پوری طرح سرکوبی ہو چکی تھی اور ان کی طرف سے اسلام کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا، ایسے وقت میں غدیر خم کے مقام پر امامت کی اہمیت کے متعلق آگاہ کیا گیا، اللہ کے حکم سے علیؑ کی امامت اور خلافت کا اعلان کیا گیا اور مسلمانوں کے لئے اس خطرے کا خدائی اعلان ہوا ''اب تک تم اپنے دشمنوں سے ڈرتے تھے کہ وہ تم کو تباہ و برباد کر دیں گے، اب یہ پریشانی دور ہو چکی ہے، اب پریشانی خدا کی طرف سے ہے، اب تم اپنے دشمنوں اور کافروں سے نہ ڈرو، بلکہ مجھ سے ڈرو کیونکہ میں تمہاری گھات میں ہوں''۔

اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ط [1]

یعنی کیا؟ مطلب صرف یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کو صرف اس بات سے خطرہ ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کے راستے سے ہٹ نہ جائیں اور خدا کو بھلا نہ دیں اور سنت کو بدل نہ دیں، یہ ناگزیر الٰہی قانون ہے کہ جو قوم خدا کے بتائے ہوئے راستوں سے بھٹک جائے تو خدا اس کی حالت کو بدل دیتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ط [2]

[1] سورہ المائدہ:۳

[2] سورہ الرعد:۱۱

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی، جب تک وہ خود اپنی
سوچ اور عمل سے اپنے آپ کو نہیں بدلتے۔

مصلح کی کامیابی کی شرطیں

ہم اس مضمون کے اختتام پر مولائے متقیان حضرت علی علیہ السلام کے نہج البلاغہ میں منقول اقوال زریں میں سے ایک قول کو بیان کرنے کا شرف حاصل کرتے ہیں جس میں انہوں نے چند ایسی خاصیتیں بتائی ہیں جو کہ ایک انقلابی مصلح کے لئے ضروری ہیں، ہم اس کی تفسیر بیان کرنے کی بھی جسارت کر رہے ہیں۔

امام علی علیہ السلام نے فرمایا:

انما یقیم امر اللہ سبحانہ من لا یصانع ولا یضارع ولا یتبع المطامع [1]

ان جملوں کا مطلب ''فرامین خدا کی تائید وحمایت کرنا'' ہے۔

پچھلی صدی میں جتنے اسلامی مصلح گزرے ہیں انہوں نے اس قول کو ''اسلامی فکر کی احیاء'' سے تعبیر کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض ایسے موقع آتے ہیں کہ کسی معاشرے میں خدا کے احکام زمین پر آرہتے ہیں، ان کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے اور ان احکام کو دوبارہ نافذ کرنا ہوتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون شخص ہے جو اس پیغمبرانہ کام کو سرانجام دینے کی قدرت رکھتا ہو؟

علی علیہ السلام کے اقوال زریں میں لفظ ''انما'' تین خصوصیات کی شرط لگاتا ہے جن سے ایک مصلح کو محفوظ رہنا چاہیے وہ یہ ہیں: مصانعہ، مضارعہ (مشابہت) اور لالچ کی غلامی۔

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار، ۱۱۰

لفظ ''مصانعہ'' کے لئے مجھ کو کوئی ایک ایسا لفظ نہیں مل سکا ہے جو اس کے مفہوم کو پورے طور پر ادا کر سکے مثلاً ''مصلحت''، ''احتیاط برتنا'' وغیرہ، یہ سب '' مصانعہ '' کے ذیل میں آتے ہیں لیکن '' مصانعہ '' کے ذیل میں آتے ہیں لیکن '' مصانعہ '' کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع ہے جب علی علیہ السلام کے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی کہ معاویہ کو معزول کرنے کے سلسلے میں جلدی نہ کریں تو اس بات کو علیؑ اور ان کے رفقاء نے ''مصانعہ'' سے تعبیر کیا یہاں تک کہ علی علیہ السلام اس ''مصلحت'' کی خاطر اس بات پر بھی تیار نہ ہوئے کہ معاویہ ایک گھنٹے بھی اپنے عہدے پر باقی رہے۔ علی علیہ السلام اس کو ''مصانعہ'' سمجھتے تھے حالانکہ یہ اس طرح کی مصلحت تھی جس سے سیاست دان کام لیتے ہی رہتے ہیں۔

بعض اوقات علی علیہ السلام کے پاس رفقاء اور احباب آتے اور منہ پر ان کی تعریف کرتے، ان کی عظمت کرتے اور ان کے لئے القابات استعمال کرتے اور اگر امور و معاملات میں ان کو کوئی نقص نظر آتا تو وہ گول کر جاتے اور ظاہر نہیں کرتے تھے۔ علی علیہ السلام سختی سے منع کرتے تھے کہ یہ طرز عمل اختیار نہ کرو اور فرماتے تھے کہ یہ طرز عمل ایک طرح کا ''مصانعہ'' ہے اور کہتے تھے:

لا تخالطونی بالمصانعة ولا تکلمونی بما تکلم به الجبابرة[1]

یعنی مصانعت کے ساتھ مجھ سے نہ ملا کرو اور میرے ساتھ وہ انداز گفتگو اختیار نہ کرو جو ظالم و جابر لوگوں کے ساتھ گفتگو کرتے وقت اختیار کیا جاتا ہے، یعنی خوشامد، چاپلوسی، تعریف و ستائش اور بڑے بڑے القابات سے اپنی گفتگو کو آراستہ نہ کیا کرو، وہ

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۲۱۶

صاف صاف کہا کرتے کہ مجھ کو یہ بات اچھی لگتی ہے کہ جب لوگ مجھ سے ملیں تو تکلفات و تعریف وستائش کی بجائے نقائص اور عیوب کو صاف صاف بیان کر دیا کریں۔

احکام خدا کے صادر کرنے کے معاملے میں جھجک اور ہچکچاہٹ ''مصانعہ'' ہے۔ امور میں دوست، ساتھی، اولاد، رشتہ دار اور مرید کے ساتھ رو رعایت سے کام لینا ''مصانعہ'' ہے۔

قرآن کریم میں لفظ ''ادھان'' [۱] آیا ہے۔ آج کل عام طور پر لفظ ''مداہنہ'' کا رواج ہے۔ ''ادھان'' یعنی ''لیپا پوتی'' یہ لفظ ایسے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے جب کسی کام کو سنجیدگی سے انجام نہ دیا جائے اور صرف اوپری سطح پر، صرف ظاہر کو درست کر دیا جائے لیکن جب کہ کام کی سپرٹ کی طرف توجہ نہ کی جائے، قرآن فرماتا ہے کہ کفار کو تو یہ پسند ہے کہ آپؐ اہل مداہنہ میں سے ہوتے تا کہ وہ مداہنہ سے کام لیتے [۲] مثلاً توحید، اخوت، مساوات، امتناع سود، ان سب کا ظاہر ٹھیک ٹھاک رہتا نہ کہ ان کی روح اور ان کی حقیقت مختصر یہ کہ کفار چاہتے تھے کہ تم اہل مصانعہ ہوتے اور تم وہ نہیں ہو، پس محض ظاہر کو سنوارنے پر قناعت کر لینا ''مصانعہ'' ہے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ خدائی احکام کی تعمیل کے سلسلے میں دوستوں، اولاد، رشتہ داروں، مریدوں کے ساتھ رعایت برتنا ''مصانعہ'' ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں ایک قصہ تاریخ میں درج ہے، جو اس لحاظ سے نہایت سبق آموز ہے:

''ایک دفعہ علی علیہ السلام سپہ سالار کی حیثیت سے سپاہیوں کے ساتھ یمن سے واپس آ رہے تھے، یمنی پوشاکیں ان کے ساتھ تھیں جو وہ بیت المال کے لئے لا رہے تھے نہ تو خود آپ علیہ السلام نے ان میں سے کوئی پوشاک زیب تن فرمائی نہ کسی سپاہی کو پہننے

---

[۱] ادھان کا لغوی مطلب منافقت ہے

[۲] سورہ القلم، ۹

دی۔ جب آپ علیہ السلام مکہ سے ایک دو منزل کے فاصلے پر پہنچے (اس وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حج کے لئے مکہ آئے ہوئے تھے) تو حضرت علی علیہ السلام اپنی کارگزاری پیش کرنے کے لئے خود آگے بڑھ گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر اپنے لشکر کے پاس واپس آئے تا کہ سپاہیوں کے ہمراہ مکہ میں داخل ہوں جس وقت آپ لشکر کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ سپاہیوں نے وہ پوشاکیں پہن رکھی ہیں۔علی علیہ السلام نے بغیر کسی ہچکچاہٹ، رو رعایت اور سیاسی مصلحت اندیشی کے وہ لباس اتروا لئے اور واپس رکھوا دیئے۔ سپاہیوں پر یہ بات گراں گزری جب یہ سپاہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور میں حاضر ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے مختلف سوالات کرتے رہے اس سلسلے میں یہ بھی پوچھا کہ کیا تم لوگ اپنے سپہ سالار کے رویے سے خوش ہو؟ وہ بولے کہ جی ہاں لیکن پھر انہوں نے پوشاکوں والا واقعہ بیان کیا، اس موقع پر حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا:

انہ لا خیشن فی ذات اللہ [1]

''وہ ذاتِ خدا کے معاملے میں بہت سخت گیر ہیں''۔

یعنی جہاں تک احکام خداوندی کا تعلق ہے وہ کسی مصانعہ اور رو رعایت سے کام نہیں لیتے، مصانعہ اور مصانعہ پسندی ایک طرح کی کمزوری اور برائی ہے جس کے مقابلے میں سخت گیری کا اصول ہے جو ایک طرح کی دلیری اور طاقت ہے۔

اور اب ''مضارعہ'' مضارعہ یعنی مشابہت، جو کسی معاشرے کی اصلاح کرنا اور اس کو بدلنا چاہتا ہے اس کو خود اس معاشرے کے لوگوں جیسا نہیں ہونا چاہیے یعنی اس کو ان

[1] فرائد السمطین، یہ حدیث ''کشن اور لخشن'' کے کلمے کے ساتھ اکثر کتب حدیث وتاریخ میں وارد ہوئی ہے ''دیکھیں: المناقب، جلد ۲ صفحہ ۱۱۰''

کمزوریوں سے پاک ہونا چاہیے جن میں اس معاشرے کے لوگ مبتلا ہیں تبھی وہ کامیابی سے ہمکنار ہوسکتا ہے۔

طبیب یداوی الناس وھو علیل	وغیر تقی یامر الناس بالتقی

[۱]

جہاں تک جسمانی بیماریوں کا تعلق ہے یہ ممکن ہے کہ کبھی ایک بیمار دوسرے بیمار کی بیماری دور کرنے میں کامیاب ہو جائے لیکن روحانی اور معاشرتی علاج کے معاملے میں یہ ناممکن ہے، اپنی ذات کی اصلاح معاشرے کی اصلاح پر مقدم ہے اسی لئے آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

''خدا کی قسم میں نے تم کو ایسی بات کا حکم نہیں دیا جس پر حکم دینے سے پہلے خود عمل نہ کیا ہو، اور تم کو ایسی بات سے منع نہیں کیا جس سے پہلے خود پرہیز نہ کیا ہو''۔

جو شخص عوام الناس کا امام و رہنما بننے کا خواہش مند ہے اس کو پہلے خود اپنی ذات کی تعلیم و تربیت پر توجہ کرنا ہوگی، اس کے بعد عوام الناس کی تعلیم و تربیت کی باری آئے گی، دوسروں کو تعلیم و ادب سے آراستہ کرنے والے سے زیادہ محترم وہ شخص ہے جو خود اپنی شخصیت کو تعلیم و ادب سے سنوارے۔

اور اب ''لالچ کی غلامی'' علی علیہ السلام نے فرمایا: **لطمع رق موبد**[۲] لالچ ایک جاودانی غلامی ہے، ہر قسم کی غلامی میں امید ہوتی ہے کہ مالک آزاد کر دے گا، لیکن لالچ جیسی غلامی میں تو ایسی کوئی امید نہیں ہوتی، اس غلامی میں وہاں کا اختیار آقا کے بجائے خود غلام کو ہوتا ہے جو شخص احکام خدا کو عملی جامہ پہنانا چاہتا ہو اس کو ان زنجیروں سے آزاد

[۱] تفسیر القمی جلد نمبر ۱ صفحہ ۴۶

[۲] نہج البلاغہ، کلمات قصار، ۱۷۱

ہونا چاہیے۔

دینی مصلح کی کامیابی کے لئے روحانی آزادی لازمی ہے، جس طرح مصلحتوں کو پیش نظر رکھنے والا گھٹیا انسان خدائی اصلاح کے سلسلے میں کامیاب نہیں ہوتا جس طرح خود بیماری میں مبتلا انسان اپنے معاشرے کو شفانہیں دے پاتا اسی طرح نفسانی طمع اور لالچ کا بندہ بھی دوسروں کو معاشرتی اور روحانی زنجیروں سے آزاد کرانے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

اے پروردگار! تو دلوں اور ذہنوں کا مالک ہے اور سب دل تیرے اختیار میں ہیں، ہم کو سیدھے راستے پر قائم اور نفس امارہ کے شر سے محفوظ رکھ۔